ڈاکٹر علی شریعتی

کی زندگی کے حالات اور اس کے آثار کا جائزہ

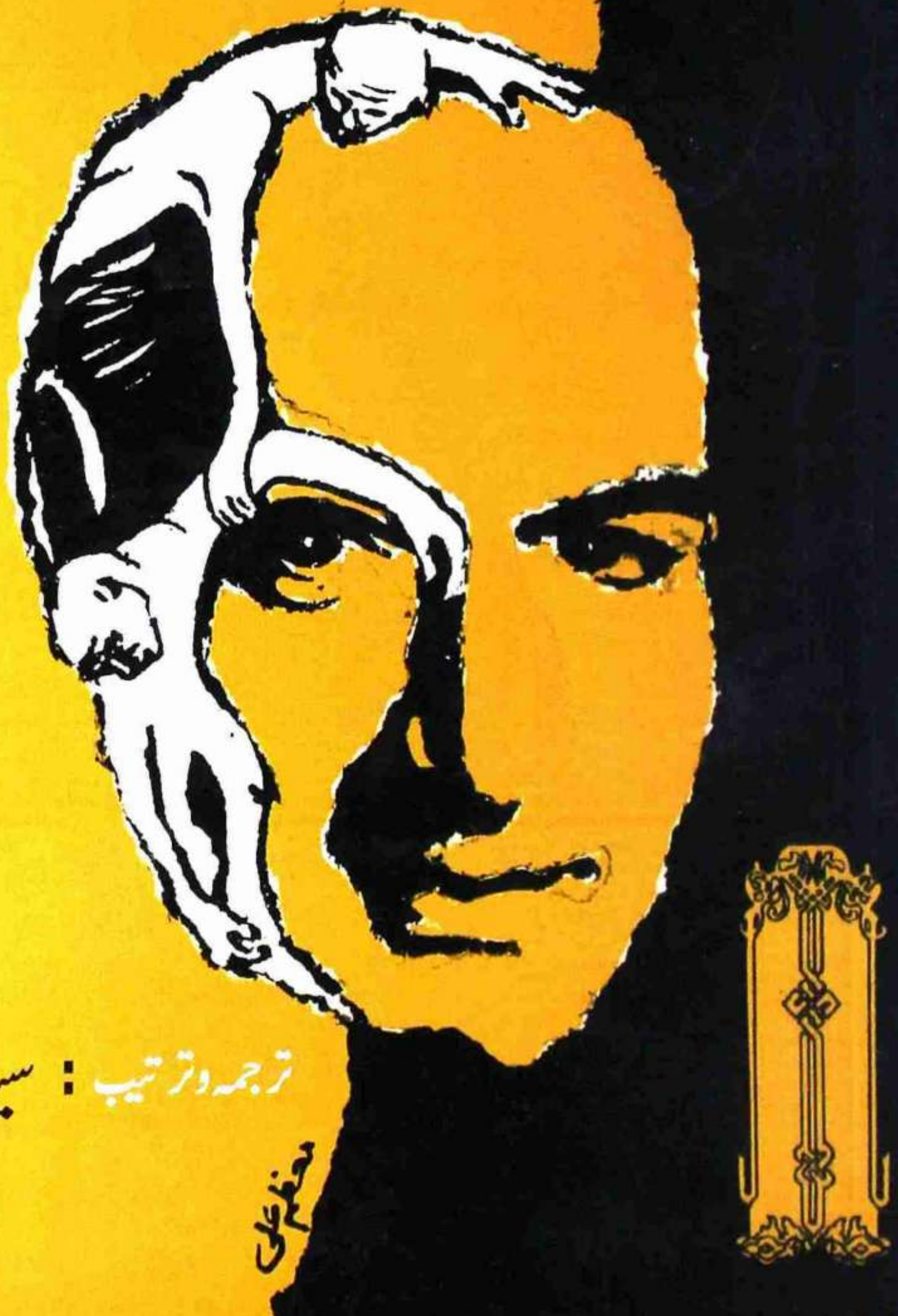

ترجمہ و ترتیب : سید محمد موسیٰ رضوی

ڈاکٹر علی شریعتی

کی زندگی کے حالات اور اس کے

آثار کا جائزہ

تنظیم و ترتیب: سید محمد موسیٰ رضوی

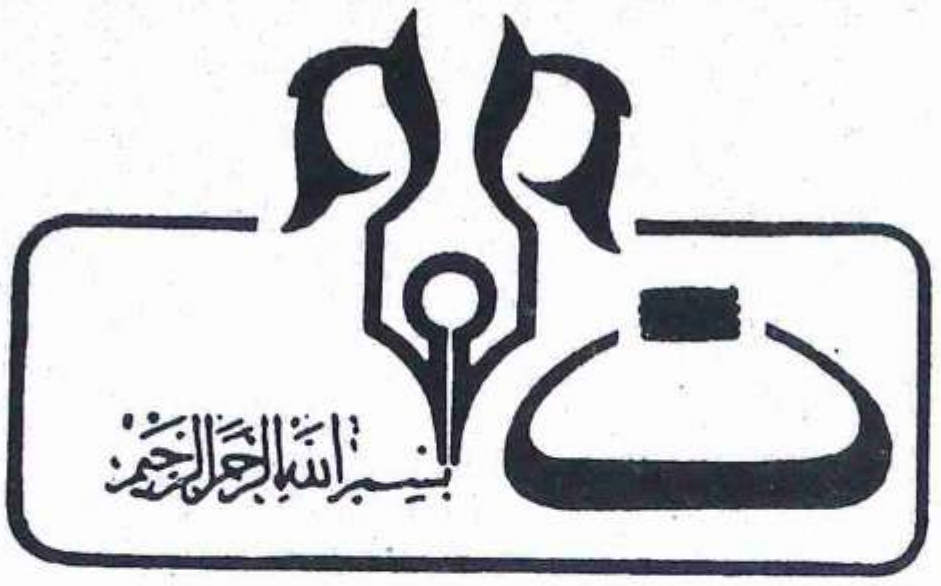

ادارہ "ن" والقلم

نام کتاب : ڈاکٹر علی شریعتی کی زندگی کے حالات اور اس کے آثار کا جائزہ

ترتیب وتنظیم: سید محمد موسیٰ رضوی

پروف ریڈنگ : سید آل حسن رضوی

سنہ اشاعت : جون ۱۹۹۹ء

ناشر : ادارہ "ن و القلم"
اے-۸۷-بلاک ۵، گلشن اقبال

فون : ۴۹۶۶۰۶۸

کمپوزنگ : وز کمپیوٹر (گلشن اقبال) ۴۹۶۷۷۵۹

قیمت : ۵۰ روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

ساری تعریف اس وجود مطلق کے لئے ہے کہ جس نے صحرائے عدم کی تاریکی میں وجود کی کرنیں پھیلائیں اور ان بے رنگ اشباح کو کہ جو ہستی و نیستی کے درمیان سرگرداں تھیں زندہ و روشن کیا۔ اور ان میں انسان کو' سر سلسلۂ موجودات اور اشرف مخلوقات قرار دیا یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ حق بندگی اور شکر نعمت کو کس طرح ادا کرتا ہے۔

اور دورد و سلام ہو محمدؐ اور ان کی پاکزاد اولاد پر جنہیں خلق فرما کر اللہ نے مخلوقات پر احسان عظیم کیا اور ظلمتکدۂ عالم کو اپنی فروغ ہدایت کے ساتھ منور کیا' تاکہ لوگوں کے درمیان انتشار و پراگندگی اور تنہائی و خود غرضی کی نحوست دور ہو اور اس کی جگہ اتحاد اور یگانگی کی نعمت مستقر ہو۔

اما بعد ہم اپنی بات کو تالئی قرآن' اخ القرآن' اور امام انس والجان کے اس جملے سے شروع کرتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا:

دانشوروں کی سوچ ایک روشن آئینہ ہے کہ جو اپنے
اندر حقائق کو منعکس کرتا ہے اور ان کا سینہ گنجینۂ
اسرار ہے۔"

لہذا ہم اس ضمن میں اس کتاب کو پیش کر کے ایک دانشور کا مختصر خاکہ آپ کے سامنے لاتے ہیں تاکہ آپ اس سے اور اس کے آثار سے متعارف ہو کر اس حقیقت کو پالیں کہ کس طرح ایک دانشور کا سینہ گنجینۂ اسرار ہوتا ہے۔ اور پھر وہ دانشور جس کا تعلق نسبی اعتبار سے بھی اور روحانی اعتبار سے بھی علمی گھرانے سے ہو' اور یہی نہیں بلکہ جس نے مغربی تعلیم بھی حاصل کی ہو' اور ایک عرصے تک ان میں اور ان کے دانشوروں میں رہا ہو۔

اس کی ذہانت' اس کی فراست' اس کی گفتگو کی تاثیر' اس کی سوچ' اس کی منطق' اس کی سخن سنجی' اس کا استدلال' اس کا طرز تخاطب' اس کا خلوص' اس کی مسحور کن باتیں' اس کا انقلابی ذہن' اس کی دلیری' اس کی بیباکی' اس کی حقیقت گوئی اور موضوع پر ہر پہلو سے اسکی گرفت اتنی لاجواب ہے کہ انتہائی مختصر عمر میں یعنی کل ۲۰ سال کی دانشورانہ زندگی میں' دور و دراز کے علاقوں میں اُس کی تحریروں اور تقریروں کے ڈنکے بجنے لگے اور دیس بدیس اس کی دھوم مچ گئی' اور اسے ایک بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی اور ہر ملک اس کا خواہاں ہوا کہ اس کی کتابوں کے ترجمے

اس کے سامنے آئیں' چنانچہ ساری دنیامیں' اور خاص کر مشرقی ممالک میں اس کی کتابوں کے ترجموں پر توجہات مبذول ہوئے اور مصر' لبنان' الجزائر' یورپ' امریکا' فلسطین' انڈونیشیا' ہندوستان' پاکستان اور بہت سے ممالک کے دانشوروں نے اس کام میں حصہ لیا اور ابھی یہ کام جاری ہے۔یہ میری خوش نصیبی ہے کہ کراچی میں اس کام کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے جسے میں انتہائی تن دہی اور ذمہ داری سے انجام دے رہا ہوں۔

علی شریعتی کی ایک بد نصیبی یہ تھی کہ اس کی عمر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ جو سب کو جگانے والا اور سب میں زندگی کی لہر دوڑانے والا تھا ساواک کی آزار رسانیوں سے سو گیا اور موت نے اس کی زندگی کے بلکورے لیتی موج کو ہمیشہ کے لے سلادیا۔اگر اس کو مہلت حیات ملتی تو یہ بات یقینی تھی کہ اس میں اور زیادہ تکامل و پختگی پیدا ہوتی اور وہ فلسفے اور معقولات پر زیادہ دسترس حاصل کرتا اور اس عنوان سے اپنے ذہن کو اور زیادہ صیقل کرتا۔

علی شریعتی کی سماجیاتی اور تاریخی فکر بہت مضبوط' بہت عالمانہ اور ہمہ گیر ہے' کسب معرفت کے لئے اس کے عطشناک اور قوی حافظے' اس کے مبارزات اور عملی تجربے' اور مختلف مکاتیب پر اس کی نگاہ نے اس کے سرمایۂ حیات کو بہت زیادہ جلا اور شادابی بخشی تھی۔ ہر کوئی ان حالات کو نہیں جانتا جن میں وہ بولتا تھا اور اگر آپ اسے اپنے ذہن میں لانا بھی

چاہیں تو نہیں لا سکتے- آپ کو نہیں معلوم کہ اس کا ہر لفظ کتنا خوشگوار ہوتا تھا جسے وہ داخِل کام تشنگاں کرتا تھا- آپ کو نہیں معلوم کہ اس کی تحریروں کی ہر ہر سطر' خاص طور پر ان نوجوانوں کے لئے جو بیرون ملک رقیبوں کی آئیڈیالوجیز کے جال میں گرفتار تھے اور ان سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا' کس آب حیات کی حامل تھیں-

بہر حال یہ سب باتیں دیباچہ میں' میں نے اس لئے کہیں کہ موقّر پڑھنے والے کے سامنے شخصیت کا ایک مختصر خاکہ آئے اور اس کے بعد وہ اس کی تفصیلات کو اس کتاب میں پڑھ کر اس بات کو سوچے کہ ہم کس جگہ کھڑے ہیں اور وہ کون تھا اور ہم کیا ہیں؟ اور شاید ہم اسی طرح رہیں-

بہر حال آغوش خاک میں اس سونے والے مرد مجاہد کو ہم اپنے عقیدتوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ :

"اے خاک کی گود میں آسودگی کی نیند سونے والے آرام کی نیند سوتے رہو کہ ہمارا قافلہ بھی شب و روز تمہارے پیچھے آرہا ہے جو آج یا کل میں تمہیں پالیگا" اب یہ نہیں معلوم کہ تمہاری طرح آبرومندی کے ساتھ یا ذلت و رسوائی کے ساتھ؟

حلقہ بگوش خاندان نبوی
سید محمد موسیٰ رضوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ڈاکٹر علی شریعتی کی زندگی کے حالات اور اس کے آثار کا جائزہ

تاریخ کے تاریک لمحوں میں کبھی کبھی تابناک سورج کی طرح کے چہروں نے بھی ضوفشانی کی ہے۔ وہ چہرے جو انتہائی گھٹن اور گمراہی کی فضا میں ستم رسیدہ لوگوں کے درمیان سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی قوم کے دکھوں کو نہ صرف اپنی فکر میں بلکہ اپنے وجود کی گہرائی میں بھی محسوس کیا ہے۔ اور اپنے زمانے اور اپنے معاشرے کو اچھی طرح پہنچانا اور اچھی طرح جانا ہے۔ ان لوگوں نے حق کی راہ اور آزادی کی راہ کو بھی پایا ہے اور اس پر اپنے عقیدے کو مستحکم کر کے سچائی کے ساتھ قیام کیا ہے۔ معاشرے کی وہ صورتحال جو خود نیز ان اعلیٰ انسانوں کے ظہور میں رکاوٹ بنتی ہے ان فطین انسانوں کی عظیم تاثیر سے متاثر ہو کر ہمیشہ مظلوم لوگوں کے حق میں بدل جایا کرتی ہے۔

ان سچے اور مخلص لوگوں کی سرنوشت ہمیشہ روشن ہوتی ہے، یعنی آزادی کی شریعت میں جہاد اور پھر، یا حق کی راہ میں شہادت یا کامیابی میں عمل

صالح (یعنی جنت نما مثالی شہر کی تعمیر کی کوشش)۔

ان ہی لوگوں میں ایک مرد مجاہد اور فطین انسان ڈاکٹر علی شریعتی مزینانی ہے جو ایران کے حالیہ سخت ترین صورتحال میں وہاں کے روشن خیال طبقے کا سب سے بڑا رہنما تھا' اس سچے اسلام کے سچے اور پاکدامن پیروکار کی زندگی اسکی تحقیق' اس کے ادراک' اس کی ہدایت' اس کی حرکت' اس کے عشق کی گرم جوشی' اس کی پائیداری اور بالآخر اسکی شہادت میں امت اسلام کے عالی رتبہ اور ممتاز پیشروؤں کی جھلک تھی۔

وہ اپنے زمانے کا ابوذر تھا۔ وہ ساری رکاوٹوں' سارے توقفات' ساری سازشوں' ساری تحریفوں اور ساری غلط توجیہوں کے خلاف بپھرا ہوا شیر تھا۔ وہ ان نام نہاد بجے ہوئے انقلابی لوگوں کی طرح نہیں تھا جو روشن خیال اور انقلابی ہوتے ہوئے استعماری اور بوسیدہ نظام کے نمک خوار' اور خونخوار مشرق اور ستمکار مغرب کے حامی تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے لوگوں اور اپنے مکتب کی ذمہ داریوں اور دکھوں سے جدا' گوشۂ عبادت میں تنہا ریاضت کرے اور کتب خانوں اور یونیورسٹیوں میں بیٹھ کر سو فیصد علمی تحقیقات میں اپنی عمر گزارے۔

وہ خدا اور اس کی مخلوق کی راہ میں جدوجہد کو اپنا اولین فرض بلکہ اپنا سرمایہ حیات سمجھتا تھا اور یہ خود اس کی کامیابی اور کامرانی کا سب سے بڑا عامل تھا۔ ایسے حالات میں جب ہر طرف سے ساری طاقتیں' ساری پارٹیاں اور

سارے مورچے سچے محمدی اسلام اور "سرخ علوی تشیع" کے خلاف محاذ قائم کر کے اس کی نابودی کی فکر میں تھے اسنے اپنے سارے امکانات کو اس راہ پر لگایا اور زندگی کی ساری ضرورتوں سے کنارہ کیا تاکہ زیادہ سے زیادہ اپنے ہدف کی راہ میں جو نئے انقلاب کو منزل کمال تک پہنچانے سے عبارت تھی؛ کامیابی حاصل کرے۔

آپ ہمہ شما کے کہنے سے نہیں' اس کے آثار' اس کے صدق' اس کی شاندار زندگی اور اس کے بے نظیر عقائد کے تجزیئے سے اس کے باطن کو پائیں گے۔ اس نے جو کچھ بھی سیکھا تھا صداقت کے ساتھ آپ تک پہنچایا اور صداقت کے ساتھ یہ بھی کہا:

"میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ اسلام اور تشیع کے بارے میں میرے سارے نظریات سو فیصد درست ہیں' لیکن قدر مسلّم یہ ہے کہ آج اسلام اور تشیع کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ نہ اسلام ہے اور نہ تشیع' اسلئے کہ اس کے پیروکار نجات یافتہ نہیں ہیں۔"

کتنے ظالم اور ناانصاف ہیں وہ لوگ جو اس کے کام کو صحیح طور پر پرکھے بغیر بلکہ اسطرح کے کام کی اہلیت کے بغیر چند ایک تاریخی' لغوی' یا اسی طرح کی بعض غلطیوں کو پیش کر کے اس پر چڑھ دوڑتے ہیں اور ان تمام نیکیوں' بھلائیوں' برکتوں اور تعمیری اور اصلاحی باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں جو اس کے وجود اور اس کے کام سے اسلام اور مسلمانوں کو میسر ہوئی ہیں۔

زندگی بھر اس کی ساری کوشش یہ رہی ہے کہ وہ کسی ناحق بات میں "ہاں" نہ کہے اور نہیں کہا۔

"کویر" نامی کتاب میں اس نے لکھا:

... "تنہائی کے خوف سے فراز تاریخ پر میں نے اپنے بھائی "عین القضات" کو دیکھا کہ ابھی اس کی زندگی کا پھول کھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کی آگاہی' اس کے احساس اور اس کی سوچ کی بے باکی کے جرم میں اسے مسل دیا گیا' اس لئے کہ جہل کے دور میں شعور' بذات خود جرم ہے' اور محروم و مستضعف لوگوں کے درمیان روح کی بلندی' دل کی دلیری' اور غدیر (تالاب) کی سرزمین پر---بدھا کی تعبیر---"خود جزیرہ بننا" ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔

جی ہاں آگاہی' احساس' سوچ کی بیباکی' روح کی بلندی اور دل کی دلیری وہ عظیم انسانی صفات ہیں جنہیں وہ اپنے اور "عین القضات" کے درمیان مشترک پا رہا تھا اور اس کی تیز بیں نگاہیں اپنے انجام کار کو عین القضات کی طرح آغاز جوانی میں اپنی زود رس موت میں دیکھ رہی تھیں۔

وہ ایک چبھتی تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ ان روشن خیال لوگوں کی مذمت کرتا تھا جو اس بات کی جرات و جسارت نہیں کرتے تھے کہ برائی کو مٹانے کے عمل میں شمولیت اختیار کریں' اور ان لوگوں کو پھٹکارتا تھا جو دوراہے پر حیران و سرگرداں' حالت انتظار میں رکے کھڑے تھے اور جنہوں نے ناکام

ہونے کے ڈر سے کسی امتحان میں شرکت نہیں کی' حالانکہ ان کے لئے راستے کا انتخاب پہلا قدم نہیں بلکہ "خودزندگی" تھی' اور تردید و دو دلی' فکری اسارت کے وجود کا ثمر تھی...' اور اس نے اپنی مختصر مگر پر ثمر زندگی میں کوشش کی کہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ سوچ اور انسانیت کے اس دیرینہ خانگی دشمن کے ساتھ دلیری سے نبرد آزما ہو۔

دوسری جانب اس نے مر مر کے جینے پر راضی ہونے اور ہر طرح کی پست زندگی کے آگے ہتھیار ڈالنے کی خلاف جنگ کی۔ اور "کس طرح ہونا چاہئے" کی بات کو لوگوں کے اذھان تک پہنچایا' زندگی کو عبث' بیکار اور بیہودہ سمجھنے والوں کے ذہنوں کو جھنجوڑا' ان "صارفین" کے خلاف جنگ کی جنہوں نے تقریباً سبھی لوگوں کو بلکہ "توحیدی دین کے متولیوں" تک کو بے خبری کی نیند سلایا اور خواب وبیداری کے درمیان کی لذیذ نیند میں مستغرق کر کے انہیں "حقیقت کے نشیب و فراز سے بھرے" راستے سے کہ جس کے لئے زندہ ایمان' تحرک فکر اور ضمیر کی آگاہی ضروری ہے غافل کر دیا' اس نے اپنی شہادت سے اس زمانے اور اس معاشرے کے پژمردہ نہال کی آبیاری کی جو صرف اور صرف ہر چیز سے ہاتھ دھونے اور جاں سے گزرنے کے بعد پھلتا پھولتا ہے۔

اس کے درد کو اس کے اندر کے آدمی کو' اس کے قلب سے نکلی ہوئی آواز سے پرکھیئے!

"میں خاموشی کو نہیں جھیل سکتا اور کچھ کہے بنا رہ نہیں سکتا۔ لیکن اب میں خاموش ہو جاؤں گا، مگر میرے اندر اس انسان کا احساس ہے جو جی سے گزرنے کی تکلیف کو برداشت کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے بعد آرام ہے، نجات ہے، اور زندگی کے دکھ سے رہا ہونا ہے کہ جو "ایک عمر انتظار کے سوا کچھ نہیں..."

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک شہید کتنی میٹھی اور پر سکون موت مرتا ہے، ان لوگوں کے لئے جو مر مر کے جینے کے عادی ہیں اور جیسے ہیں ویسے رہنا چاہتے ہیں، موت زوال کا ہولناک اور ناخوشگوار المیہ ہے، نیستی میں گم ہونا ہے۔ جس نے اپنے آپ سے ہجرت کا عزم کیا اس نے موت سے اپنا آغاز کیا۔ کتنے عظیم ہیں وہ لوگ جو اللہ کے اس حیرت انگیز فرمان کو سن کر اس پر کاربند ہوئے کہ :

"موت کو گلے لگاؤ قبل اس کے موت تمہیں گلے لگائے۔"

جو لوگ علی شریعتی سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے آثار و افکار کا مطالعہ اور اس پر غور و خوص کتنا سبق آموز اور پر معنی ہے اور اس کی راہ اور اس کی طرز زندگی کتنی صحیح اور عمیق جہاں بینی کو منعکس کرنے والی اور اس کے مستحکم ایمان کی مظہر ہے۔ اس کی پوری زندگی مسلسل کام، مسلسل جدوجہد اور ایک آگاہ انسان کی جانثاری، اس کی مجاہدت، اس کی مسئولیت اور اس کے ایمان و عشق کی سر تا سر تصویر ہے۔

اس کے تعارف کے لئے ہم کسی اور کو اس سے بہتر نہیں پا سکتے۔ وہ اپنے تعارف میں آپ کہتا ہے :

"میں ان ہزاروں افراد میں سے ایک فرد کے عنوان سے جو اس ملک میں اور اس موجودہ زمان و زمین میں اپنی صورتحال کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور اس کے لئے کوئی راہ حل اور نجات کا راستہ تلاش کر رہے ہیں گفتگو کر رہا ہوں' میں ایک طرف سے اس عالم میں کہ بیسویں صدی میں ہوں' بیسویں صدی میں زندگی بسر نہیں کر رہا ہوں' بیسویں صدی کے حوادث' مشکلات اور دکھوں نے مجھ پر میری سرنوشت پر اور قوم پر ایک دباؤ ڈال رکھا ہے۔"

اور دوسری طرف سے میں ایک انسان ہوں اور خلقت اور اس کائنات میں مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ "انسانی وجود" کے اعتبار سے میری ذمہ داری کیا ہے ؟ مجھے کس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے ؟ میری سرنوشت اور سرگزشت کیا تھی ؟ اور میری سرنوشت کیا ہے ؟ میں کیوں آیا ہوں ؟ مجھ سے میری زندگی کیا کام لینا چاہتی ہے اور اس روح و تدبیر کی پیدائش کا مفہوم کیا ہے جس کا خلقت پر تسلط ہے ؟

اور تیسری طرف سے کرہ ارض کے اس علاقے سے میرا تعلق ہے جو اپنے گذشتہ حال اور آئندہ کے ساتھ مشرقی دنیا کہلاتی ہے اور اپنی تین حالتوں میں یہ قابل غور' وسوسہ انگیز اور درد آور ہے۔

"اور اسی طرح میں اس قوم اور اس امت سے وابستہ ہوں جو اسلامی

امت کہلاتی ہے اور میری سرشت' میرا احساس اور میری تربیت اس سے جڑی ہوئی ہے اور یہ امت' ایک ایسی حالت میں ہے اور ایسے عوامل سے دکھ جھیل رہی ہے جس کے مقابل میں خاموش نہیں رہ سکتا اور احساس ذمہ داری سے عاری نہیں ہو سکتا۔"

اس کے لئے در حقیقت' جینا اہم نہیں تھا' کس طرح جینا اور کیوں جینا اہم تھا' اور اسی لئے اس نے ابتدائے زندگی سے نہ صرف اپنی زندگی کو بنانے اور اسے معنی بخشنے پر توجہ دی بلکہ اس بھاری "بار امانت" پر بھی اس کا دھیان رہا جو اس کے آباؤ اجداد سے اسے ورثہ میں ملا تھا اور وہ اسے جلد از جلد منزل مقصود تک پہنچانا چاہتا تھا' اور جیسا کہ اس نے اپنے والد بزرگوار کے نام اپنے آخری خط میں لکھا ہے' وہ اس کام کے لئے ایک لمحہ کو بھی بیہودہ اور بے نتیجہ تلف نہیں کرنا چاہتا تھا:

"میں اس خدائے بزرگ و برتر کے لطف و کرم کے آگے شرمندہ ہوں جس نے اپنی ڈھیر ساری اعجاز آفریں محبتوں سے میری روح میں ایک ہلچل بپا کی ہے اور باوجود اس کے کہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا اس نے مجھے اس راہ کا رہرو بنا دیا ہے' اور اب میں اپنی عمر کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی توفیقات میری ناتوانیوں کا ازالہ کر رہی ہے۔ اس سے زیادہ لذت کس بات میں ہے کہ وہ حقیر عمر جو ہر صورت سے گزر جاتی ہے' اس صورت سے گزرے... ؟"

وہ بار امانت جو نہ صرف اس کے قریبی آباء واجداد سے اس کی زندگی پر بوجھ تھا بلکہ حقیقت اور حق طلبی کا وہ بار بھی جو طول تاریخ اور ہر زمانے میں مظلوموں، ستم رسیدہ لوگوں اور صاحبان درد کے کاندھوں پر رہا ہے، وہ بار امانت جو "حسینؑ وارث آدم" میں جلا کی بلندی تک پہنچتا ہے اور جناب زینبؑ اسے شام میں یزید کے دربار تک لے جاتی ہیں اور جو ہر روز پہلے سے زیادہ مردانِ حق کے دوش پر دباؤ ڈالتا ہے۔

وہ خود اس بات کا معتقد تھا کہ اسلام میں وراثت، ایک فلسفی اور اعتقادی اصل ہے اور اس اصل سے اسلام چاہتا ہے کہ ان گوناگوں، رودادوں اور ان متفرق واقعات میں جو مختلف سرزمینوں اور مختلف وقتوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ایک ایسے ملے ہوئے کئی جہت والے سلسلے کو سامنے لائے جن کا ایک دوسرے سے رابطہ ہے اور جو ایک منطقی علیّت اور علمی قانون سے ظہور پذیر ہوتے اور مرتے ہیں اور ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر قائم کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک واحد سلسلے سے، ایک واحد حلقے کی تشکیل کرتا ہے کہ جس کا سلسلہ آغاز بشریت (یعنی آدم) سے تضاد اور تنازع کے نظام کے اختتام (آخر الزماں) تک جاری رہتا ہے اور اسے منطقی تسلسل، اور تاریخ کی جبری بقا کا نام دیا جاتا ہے۔

تاریخ کی امانت کا یہ بھاری بوجھ کہ جس سے وہ ایک لحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہے اس کے قریبی آباء واجداد سے اسے ملا ہے اور یہ اس کی

زندگی میں اچھی طرح نور بکھیر تا ہے' اس زندگی میں جس کا آغاز صحرا سے ہوتا ہے اور ایک وسیع تاریخی- سماجی جہاں بینی پر کہ جو نوجوان نسل کی فکری ہدایت کے لئے ایک پیام اور زمانے کو درکار' "واسطے والی راہ" کی شناخت کے لئے ایک جستجو ہے' اگر ختم ہوتا ہے' اور پوری آگاہی اور اپنے انتخاب کے ساتھ ان تمام افراد کی سرنوشت کی راہ کو کہ جو اس کے دکھ اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں' طے کرتا ہے اور شہیدان تاریخ کے انبوہ میں ایک اور "شاہد" کا اضافہ ہو جاتا ہے-

علی شریعتی ۱۳۱۲ شمسی (۱۹۳۳ء - ۱۳۵۳ھ) کو مشہد کے اطراف کے علاقے مزینان میں علم و دانش سے تعلق رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہوئے- دوسرے بلند پایہ علماء کی طرح اس کا تعلق بھی گاؤں سے تھا- وہ خود اپنے اجداد کے سلسلے میں جن کا شمار اپنے دور کے صف اول کے علماء میں ہوتا تھا اور جنہوں نے شہر کے غل اور شور شرابوں پر صحرا کے خاموش اور پر سکون گوشے کو ترجیح دی تھی فخر و مباہات کرتا ہے- اچھا ہے کہ آپ اسی کی زبان سے اس کی باتوں کو سنیں :

"میرے دادا نے ۸۵ سال پہلے مشروطیت کے دور میں کلام' حکمت اور فقہ کے علوم کو اپنے ماموں' علامہ بہمن آبادی سے پڑھا تھا اور حکیم اسرار کے ساتھ ان کی چپقلش چلتی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ بہمن آباد میں مزینان کے قریب ایک غیر معروف گاؤں میں رہتے تھے تہران' مشہد'

اصفہان' بخارا' نجف اور دور دور تک علمی حوزوں میں ان کی شہرت تھی۔ جب تہران میں انکی فطانت کی دھوم ہوئی تو ناصر الدین شاہ نے انہیں تہران بلایا اور وہاں وہ "سپہسالار" میں فلسفے کا درس دینے لگے' مگر ان کے خون میں شامل خلوت و تنہائی کا وسوسہ انہیں پھر بہمن آباد کے گوشۂ عزلت میں کھینچ لایا... اور ایسے وقت میں جب کمال کی گھڑی تھی اور جاہ' منصب' روحانی مقام' بلند پایہ علمی مسند' خلق کی سر خیلی' مرجعیت اور نام و نمود کے حصول کا وقت آیا تو انہوں نے ان سب باتوں کو چھوڑ دیا..."

... اور ڈاکٹر نے ان پاکیزہ اجداد کی حیات و ممات سے بڑے سبق سیکھے' بڑی عبرتیں حاصل کیں' خاص طور پر ایسے زمانے میں اپنی انسانی قدروں کو باقی رکھا جب زندگی انتہائی آلودہ تھی اور انسانیت پر باقی رہنا سخت دشوار تھا اور اس کے لئے ہر روز سخت جہاد کی ضرورت تھی اور ہر روز جہاد ہر کسی کے بس کی بات نہیں!

"آخوند (دینی علوم کا درس دینے والا) حکیم میرے پردادا تھے' ان کے بارے میں جو باتیں بتائی جاتی ہیں وہ میرے لئے کتنی مسرور کن ہیں۔ میں ان باتوں سے اپنے وجود کی گہرائی میں اترے ہوئے ان بہت سے ناشناختہ پائیدار احساسات کے فطری سرچشمہ کو ڈھونڈ نکالتا ہوں... میں خود کو اس دنیا میں آنے سے ۸۰ اور نصف صدی پہلے' ان میں محسوس کرتا ہوں... اور اب میں ممنون ہوں کہ وہ ایسے تھے اور انہوں نے ایسا کیا۔"

ان کے چچانیز حوزہ ادیب کے ممتاز ترین طالب علم تھے۔ انہوں نے فقہ وفلسفہ وادبیات کی تعلیم کے بعد پھر اپنے اجداد کی راہ اختیار کیااور مزینان گئے۔

علی شریعتی اپنے اجداد کی راہ وروش اور ان کی انسانیت اور علم کو اپنی میراث سمجھتے تھے۔وہ ان بزرگوں کو اپنے وجود میں زندہ پاتے تھے اور ان سب کو ہدایت کے نور کی طرح اپنی راہ کے ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔

لہٰذا وہ شخص جو ہر کسی سے زیادہ ان کا روحانی معلم تھااور جس نے انہیں اتنی رخشندگی اور تابندگی دی وہ ان کا اعلیٰ صفات باپ محمد تقی شریعتی تھا۔اور حق یہ ہے کہ ایسا ہی کوئی مکتب اور مشرب اس جیسے فرزند کو جو ہر وجود انسانی میں ڈھال سکتا ہے:

"لیکن میرے والد بزرگوار نے روایت شکنی کی اور جب ان کی تعلیم ختم ہوئی تو وہ گاؤں نہیں لوٹے اور انہوں نے شہری زندگی اختیار کی' اور ہم نے دیکھا کہ ان کے ساتھ کیا گزری' اور کتنی سختیاں جھیلنے کے بعد انہوں نے شہری زندگی کے اس دلدل میں علم وعشق وجہاد کے ساتھ زندگی بسر کی اور دامن تر نہیں کیا۔"... "اور میں (شہری زندگی اختیار کرنے کے) اس فیصلے کا پروردہ اور اتنی ساری غیر منقولہ جائیدادوں کا تنہا وارث کہ جسے ایک نادار ملک میں (یعنی تعلیمی افلاس کے شکار ملک میں) چھوڑا گیا ہے... اور ان قابل احترام امانتوں کا حامل... اور اب ان امانتوں کے بھاری بوجھ سے جو میرے کاندھوں پر ہے بے بس..."

مشہد میں "کانون نشر حقائق اسلامی" نامی ادارے کے موسس، عالی جناب محمد تقی شریعتی کا شمار کہ جو اعلیٰ پائے کے دانشور اور مجاہد بھی ہیں، اسلامی تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے کہ جو چالیس سال سے مسلسل منطقی، علمی اور ترقی پسندانہ انداز میں نمایاں طور پر خدمت انجام دے رہی ہے۔ یہ تحریک خاص طور پر مادیت، مغرب پرستی اور مذہب سے دشمنی کے باب میں بالخصوص نوجوان نسل کو ایمان اور اسلام کی طرف واپس لوٹانے میں پیش پیش رہی ہے، اور تبلیغات، تحقیقات اور اسلامی اور شیعی تعلیمات میں اصلی محور کے عنوان سے قرآن کے تعین کی سوچ اور نیز گذشتہ برسوں میں تفسیر قرآن کے سلسلے میں ایک خاص مکتب کی تشکیل، بہت حد تک ان ہی کی مرہون منت ہے۔

علی شریعتی کے والد کی خصوصیت اور ان کے کردار کی تاکید پر ان لوگوں کی تاکید جو اس علمی تحقیقاتی کام کرنے والے باہمت جوانمرد اور شریف النفس انسان سے واقف ہیں، ہمیں ڈاکٹر علی شریعتی کی زندگی کے گوناگوں ابعاد کی بہتر شناخت میں مدد دیتی ہے اور اس حقیقت کی ایک بار پھر تائید کرتی ہے کہ فہم و شعور و فطانت بقدر کفایت جب کسی ہنر مند استاد کے ہاتھ آتی ہے اور موافق و مثبت حالات میں بڑھتی ہے اور پرورش پاتی ہے تو آئے دن کی موت کے پشتہ کو توڑ کر زمانے کی حد سے آگے نکل جاتی ہے اور متاثر شخص کو موثر انسان میں بدل دیتی ہے اور اس کو تسلیم کی کیفیت سے

تاثیر بخشی کی کیفیت میں لے آتی ہے- وہ لوگ کہ جو دور اور قریب سے علی شریعتی کے والد سے تعلق خاطر رکھتے ہیں اور ان کی علمی، دینی، سماجی، سیاسی اور انسانی زندگی کے مختلف ابعاد سے واقف ہیں وہ ان کی جانثاری، ان کے صبر و تحمل اور معارف کی گہرائی کو جانتے ہیں اور ان کی دینی اور فلسفی کتابوں مثلاً قرآن و سنت کی نظر سے "خلافت و ولایت"، "وحی و نبوت"، "علی رسالت کے گواہ"، "موعود ادیان"، "دین کی ضرورت اور اس کا فائدہ"، "اسلام کا اقتصادی مکتب" اور خاص طور پر "تفسر نوین" سے واقف ہیں اور بالآخر اس کے اخلاق، اس کے جذبات اور اس کے اُس استعداد کُش، نامانوس اور صلاحیتوں کا گلا گھوٹنے والے کے خلاف مبارزات سے واقف ہیں جو ہر جگہ "دینی" سماجی اور دانشگاہی دائرہ ہائے کار میں موجود تھے- یہ لوگ بنیادی باتوں اور اسلامی مسائل کی نسبت رابطوں، روشوں اور طور طریقوں کی تبدیلیوں کے خلاف، اس کی کوششوں کے اثرات اور اس زمانے کے سخت کشیدہ حالات میں اس کے مناسب اور صحیح اقدام سے آشنا ہیں- ہمارے زمانے میں بہت کم ایسے باپ ہیں جو اس طرح کے فرزند کو پالتے اور قوم کے حوالے کرتے ہیں :

"میرے والد میری روح کے ابعاد کے پہلے معمار ہیں- وہی ہیں جنہوں نے مجھے پہلی بار سوچنے کا ہنر سکھایا اور انسان ہونے کا فن بھی- وہی ہیں جنہوں نے اس وقت سے جب سے میری ماں نے میرا دودھ چھڑایا،

آزادی' بزرگی' پاکدامنی' مناعت (عالی طبعی)' عفت روح' استواری' ایمان اور استقلال قلب کے ذائقہ کو میرے وجود میں اتارا۔ پہلی بار انہوں نے اپنی کتابوں سے میری دوستی کرائی۔ ابھی میں چھوٹا ہی تھا اور تحتانیہ اسکول کے ابتدائی برسوں کا دور تھا کہ میں اپنے والد کے رفیقوں' ان کی کتابوں سے آشنا ہوا۔ میں ان ہی کے کتب خانے میں --- کہ جو ان کا کنبہ اور ان کی زندگی تھی--- پلا' بڑھا اور جوان ہوا... انہوں نے بہت سی ایسی چیزوں کو کم سنی ہی میں مجھے ہدیہ کیا جو بہت بعد میں بڑے ہونے پر' بہت تجربوں' بہت کشمکشوں اور برسوں کی مسلسل کوششوں کے بعد ہاتھ آتی ہیں۔ میرے والد کا کتب خانہ میرے لئے میری عزیز ترین یادوں بھری دنیا ہے۔ اس کی ایک ایک کتاب بلکہ ان کی جلدوں سے میرا تعلق خاطر ہے۔ میں اس پیارے اور مقدس کمرے کو جو میرے اچھے' دلپسند اور گزرے ہوئے دنوں کا مجموعہ ہے' بہت چاہتا ہوں۔"

... لہٰذا فطانت اور استعداد' ماحول کے پشتے کو توڑتی ہے اور زمانے کو پار کر جاتی ہے' اثر پذیری کے لئے انسان' موجودہ کیمپوں یا موجودہ مراکز کو صرف تیز ترجست' دور تک رینج کے لئے انتخاب کرتا ہے بغیر ازیں کہ خود کو ان کا اسیر بنائے اور اس ماحول میں گھر کر رہ جائے۔ وہ ماحول کے دباؤ' اس کی سختیوں' اس کی پرورش اور روایتی سانچوں سے واقف تھا اور ان پر مسلط ہونے اور انہیں اپنے ارادے کے تحت لانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اسی مزاج کا آدمی

تھااور اس نے ایسا کیا- وہ سیکھنے کے دوران سکھاتا تھااور آرام کے دوران فکر کو ان منزلوں تک لے جاتا تھا کہ ہر ایک یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اپنے ماحول اور زمانے سے چند قدم آگے چل رہا ہے-

استعداد، فکر کے لئے مناسب ماحول اور سب سے بڑھ کر سماجی اور علمی تواضع کے ساتھ اسلامی حقائق کے صاف و شفاف سرچشموں کی حقانیت پر اس کا عشق و ایمان اس بات کے لئے کافی تھا کہ وہ اپنے اعلیٰ اہداف کے لئے ہر مناسب موقع اور ہر ممکن ذریعے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے-وہ خود اپنے تربیتی ماحول کی اسطرح توصیف کرتا ہے :

"کتنی بڑی نعمتیں میری زندگی سے وابستہ رہی ہیں، بلاوجہ میں کفران نعمت کرتا ہوں- کوئی شخصی زندگی سے اتنا بہرہ مند نہیں ہوا جتنا میں ہوا ہوں-وہ عظیم، زیبا، رنج سہنے اور اصلاح عمل کرنے والے غیر معمولی افراد جنہوں نے اپنی راہ میں کچھ عرصے مجھے اپنے ساتھ رکھا، میری روح میں سما گئے ہیں- میں ان سب کو اپنے باطن میں واضح طور پر اب بھی محسوس کرتا ہوں اور ان ہی کے ساتھ رہتا ہوں اور انہی کے ساتھ جیتا ہوں اور یہ سب میرے اندر موجود ہیں..."

وہ ان عظیم ہستیوں کے منبع فیض سے جو اس کے مربی اور معلم تھے اور نیز ان اعلیٰ صفات کے حامل انسانوں سے جنہوں نے اسے سچے اسلام کے ابعاد اور راہ تفکر و جہاد کی تعلیم دی تھی الہام لیتا تھا اور تفکر و تعقل اور حقیقت

سے عشق کو اپنے من میں سمائے کوشش اور مسئولیت کے ساتھ کمال اور جاودانی زندگی کی شرائط کو طے کر رہا تھا- ان سب باتوں کے باوجود اس نے کبھی اپنے ہمیشہ کے گھریلو ماحول سے قطع رابطہ نہیں کیا- اس نے کبھی صحرا کو اپنی یاد سے نہیں بھلایا اور اپنے نام کے آگے مزینان کے لفظ سے اس کے ہونٹوں پر ایک رضایت بخش مسکراہٹ کھیل جاتی تھی-

وہ بچپن اور نوجوانی میں دوسرے طلباء کی طرح ایک طالب علم تھا' دوسروں کی طرح اسکول جاتا تھا- اس نے مشہد ابن یمین نامی پرائمری اسکول اور پھر فردوسی نامی سیکنڈری اسکول کی کلاسوں کو مرحلہ وار طے کیا اور اس کے ساتھ عربی سیکھی اور دینی تعلیم حاصل کی- سیکنڈری اسکول سے فارغ ہونے کے بعد اس میں مدرس بننے کا شوق ابھرا' اور یہ شوق شاید اس کے والد یا زندگی کے حالات نے اس میں پیدا کیا- اس نے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا- ان دنوں مدرس کی بڑی وقعت تھی اور یہ ایک انتہائی معزز پیشہ تھا- علی شریعتی نے یہاں اپنی تعلیم پوری کی اور مشہد کے ایک قریبی گاؤں میں پڑھانے پر مامور ہوا- لیکن اسی دوران وہ ایک رائٹر کی حیثت سے ابھرا اور اس نے فلسفۂ تاریخ پر "مکتب واسطہ" نامی کتاب لکھی- اس کے علاوہ اس نے مشہد کے "کانون نشر حقائق اسلامی" میں طالب علموں اور روشن خیال لوگوں کے لئے لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا-

جس چیز نے اسے سنوارا اور اس کی فطری جہت متعین کی وہ اس کی

ہائر ایجوکیشن اور بیرون ملک اعلی تعلیمات نہیں تھیں بلکہ جاننے' سوچنے' خلاقیت اور ذمہ داری نبھانے کی نسبت اس کا وہ تعلق خاطر تھا جو دینِ مبینِ اسلام کے ایمان راسخ سے پھوٹتا تھا اور نیز وہ ابتدائی ماحول بھی' جو مسلسل اس کی ہدایت کرتا رہتا تھا۔ "کانون نشر حقائق اسلامی" جو تیس سال سے اپنی خدمات جاری رکھے ہوئے تھا' مشہد کے صاحبان ایمان اور روشن خیال حضرات کی فکری تحریک کا وہ سرگرم اور پرجوش و خروش مرکز تھا کہ جس نے علی شریعتی کی تعمیر کی اور علی شریعتی نے بھی اس کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا' اور اس کی تقریروں' سوال و جواب کے جلسوں اور اجتماعات کے انتظام و انصرام میں پیش پیش رہا۔ وہ شروع ہی سے فکری بالیدگی اور فروغ ایمان کی نسبت تقریروں اور تحریروں کا دلدادہ تھا۔ اور اس راہ میں اس کی شعلہ بیانی اور پر کیف و پر ثمر تحریر اس کے شوق کو بڑھانے والی تھی۔

یہیں سے اس نے اپنے علمی اور فلسفی مقالات کا آغاز کیا اور یہیں سے اس کی آشنائی "سوشلسٹ خداپرستوں کی تحریک" کے افکار سے ہوئی۔ یہ وہ تحریک تھی جسے ۱۳۲۳ اور ۱۳۲۴ شمسی (۱۹۵۳ اور ۱۹۵۴ عیسوی۔ ۱۳۶۴ اور ۱۳۶۵ ہجری) میں ایران کے جوشیلے نوجوانوں نے مخفی طور پر تہران میں قائم کیا تھا۔ یہ لوگ توحیدی جہاں بینی اور خدائے یگانہ پر ایمان کے ضمن میں اقتصادی نقطہ نظر سے' اسلامی اقتصادی سسٹم کو کسی

قدر سوشلزم سے وابستہ کرتے تھے اور ایک ایسی انقلابی تحریک پر اعتقاد رکھتے تھے جو سارے توحیدی اقدار کو قائم کرے۔

یونیورسٹی کی تعلیم سے پہلے فرانسیسی اور عربی زبانوں پر اس کی دسترس ایسی ہو گئی تھی کہ اس نے ان زبانوں کی کتابوں کے ترجمے شروع کر دیئے۔ اس ضمن میں اس کی "مکتب واسطہ" نامی ایک کتاب بصورت تالیف' اور "ابوذر غفاری" اور "دعا" نامی کتابوں کے دو ترجمے نہ صرف اس کی فکری وسعت اور ترجمہ پر اس کی دسترس کے گواہ ہیں بلکہ ان کتابوں پر اس کا موثر اور پر کشش مقدمہ اس کی فکری جہت اور اسلامی سوچ کی آئینہ دار ہے۔اس کی نظر میں اسلام' مختلف فلسفی مکاتیب کے درمیان' خاص طور پر سوشلیزم اور سرمایہ دارانہ نظام میں "مکتب واسطہ" کے عنوان سے ظاہر ہوا تھا کہ جو ان میں سے ہر ایک کے مثبت جہات اور ترجیحات کا حامل ہونے کے باوجود ان کے منفی پہلوؤں سے الگ ہے۔

لہٰذا جو بات اس کی نظر میں اہم تھی وہ تغیر افکار اور استعمار دشمن تحریکیں تھیں جو ان دنوں پورے اسلامی ممالک میں شمالی افریقہ سے انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان ملکوں میں ایک عمومی انقلاب کی نوید دے رہی تھیں۔ "ابوذر غفاری" اور "نیایش" (دعا) نامی مختصر مگر انتہائی پر تاثیر کتابوں کے ترجموں نے جو اس کی زندگی کے اس دور کی یادگاریں ہیں اور اسلام کے پاکیزہ اور خالص سرچشموں اور بزرگان دین کے کردار اور

ان کی سیرت کی نسبت اس کی توجہ کو ظاہر کرتے ہیں' نوجوانوں کے ذہنوں پر ایک ناقابل انکار اثر چھوڑا ہے۔

۱۳۳۵ شمسی (۱۹۵۶ء-۱۳۷۶ھ) کو مشہد میں دانشکدہ ادبیات کا قیام عمل میں آیا اور اسے اس بات کا موقع ملا کہ وہ تدریس کے ساتھ ساتھ اس کالج میں بھی طلباء کے پہلے گروپ کے ساتھ داخلہ لے۔ یہاں اساتذہ کے ساتھ اس کا فکری ٹکراؤ رہتا تھا۔ وہ اپنی سوچ اور فکری جہت کے آگے بند نہیں باندھ سکتا تھا۔ چنانچہ کلاسوں اور کانفرنسوں میں اکثریت کی طرح متاثر ہونے سے زیادہ موثر تھا۔ مطالعہ میں اس کی خاص توجہ تاریخ ادیان' تاریخ اسلام اور فلسفہ تاریخ پر تھی اور ٹائن بی کا فلسفۂ تاریخ اس کے لئے بہت سے سوالات فراہم کرتا تھا اور وہ اس پر بہت سے اعتراضات کرتا تھا۔

مشہد کے اس دانشکدہ میں تعلیم کے دوران اسلامی تحریک سے اس کی واقفیت بڑھتی گئی اور اس نے بھرپور طور پر اس میں شرکت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر مصدّق کی رہبری میں قومی مبارزات زوروں پر تھی۔ مصدّق' عالم کے تمام استعمار گروں اور استثمار گروں کے مقابل ایک محروم اور ستم رسیدہ قوم کی استقامت اور ٹکراؤ کا مظہر تھے۔

علی شریعتی مصدّق کے فریفتہ تھے اور ایک گمنام سپاہی کی طرح مصدّق کے قومی مبارزات میں اپنے والد سمیت جو خراسان میں قومی تحریک کے اعلیٰ عہدہ داروں سے تھے۔ ان کے شریک کار تھے' اس نے استعمار سے

جنگ، حریت طلبی، حق طلبی اور سیاسی شعور کو سب سے پہلے اس سنہرے دور میں حاصل کیا اور تیسری دنیا میں ضعیف اور استعمار کی شکار قوموں کی وحدت کی ضرورت کو سمجھا، اور قوموں کے استعمار اور مفادات کی تقسیم میں مشرق و مغرب کے دونوں بلاکوں کے کردار کو بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔

افسوس کہ ۲۸ مرداد ۱۳۳۲ شمسی (۱۹۶۳ء - ۱۳۷۳ھ) کو "انٹیلیجنس" کے فوجی انقلاب نے ڈاکٹر مصدق کے قومی انقلاب کو سمیٹ دیا اور اسے گرفتار کر کے پسِ دیوارِ زنداں ڈال دیا اور اچانک اہل ایران کی امیدوں اور آرزوؤں کا محل ڈھیر ہو گیا اور بہت سے قومی رہبر اور قابل احترام لوگ خاک و خون میں مل گئے۔

شریعتی بھی موت و حیات کی اس جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا۔ وہ اپنے وطن کی ذمہ داری کو فراموش کر کے استعمار و استبداد کے مقابل سر تسلیم خم نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ مشہد میں حصول علم کے دوران ہی سے قومی استقامتی تحریک میں شامل ہوا اور نوجوانوں کے مبارز ترین اور پرکار ترین کیڈٹ کا حصہ بنا۔

اس کے ایمان اور فکری استقلال کی نشاندہی کرنے والی چیز، حق و حقیقت کی نسبت اس کی انتہائی سخت حمایت، اور حوادث، واقعات اور لوگوں کی سیاسی، سماجی اور دینی سرنوشت پر اس کی خاص توجہ تھی۔ اس تباہ کن

خاموشی میں جو اِن دنوں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی وہ کسی طرح بھی اپنے آپ کو مجاہدات' سماجی مبارزات اور حق و باطل کی جنگ سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس مجاہدات کے ضمن میں اس کی تقریروں' اس کی تحریروں اور اس کی "استقامت" نے اس کے خلاف "فائل" کھول دی تھی' اس لئے کہ وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا اور خاموش بیٹھ کر موجودہ منفی تعاول کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا' وہ اسی وقت سے دو محاذوں پر لڑ رہا تھا۔ اس کے ایک طرف وہ انتہا پسند رسم و رواج کے پابند افراد تھے جنہوں نے اپنے گرد جال تن کر اسلام کے دین کو سماج سے الگ کر دیا تھا اور مدرسے اور مسجد کے گوشے میں دبکے بیٹھے تھے اور ہر انقلابی اور ہر فکری تحریک کی نسبت منفی رد عمل ظاہر کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے اسلام کے درخشاں حقائق پر پڑے ہوئے سیاہ پردے میں اپنا منہ دے رکھا تھا؛ اور دوسری طرف وہ مقلّد اور بودے روشن خیال لوگ تھے جنہوں نے جدید "اسکولیسٹک" کو اپنا مورچہ بنالیا تھا اور عصر جدید کے تباہی اور انحطاط کے آگے متواضعانہ انداز میں جھک گئے تھے...

حکومت اس تحریک سے گھبرا گئی اس نے فیصلہ کیا کہ حکومت مخالف مومن مبارزین کا راستہ روکا جائے اور قومی استقامتی تحریک کو مفلوج کر دیا جائے' لہٰذا علی شریعتی کو ان کے والد' طاہر احمد زادہ اور مشد کے کچھ اور افراد کے ساتھ گرفتار کر کے ایک فوجی ہوائی جہاز کے ذریعے

تہران لایا گیا- شریعتی دوسروں سے سن میں کم تھے' لہٰذا جوانی کے پیش نظر حکومت کے کارندوں کے تشدد اور عذاب کو جھیل سکتے تھے- اس کے سر کو مونڈھ کر اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے- وہ آٹھ ماہ کی قید کے دوران حکومت کے بد نہاد جلادوں اور درندوں کے ظلم و تشدد سے آشنا ہوا اور اس نے اپنی تنگ و تاریک کال کوٹھری سے ساری دنیا اور ساری تاریخ کے لئے ایک دریچہ کھولا اور تاریخ کے جباروں اور ستم گروں کے ظلم و ستم کا لمس کیا اور اپنے زمانے کے سارے اسیروں اور ستم رسیدہ لوگوں کے دکھ اور عذاب سے ایک گہرا تعلق قائم کیا-

ڈاکٹر علی شریعتی نے ستم رسیدہ لوگوں کے تلخ تجربے اور زندان کی ساری زد و کوب کو صبر' توکل' اور ایمان کی قوت سے جھیلا اور اپنے فولادی ارادے اور امید سے لبریز جذبے کے ساتھ کفر و ظلم و جہل کے خلاف جنگ کو جاری رکھنے کے لئے زندان سے چھٹ کر مشہد آیا اور پہلے اپنی تعلیم پر توجہ دی اور ۱۳۳۷ شمسی (۱۹۵۸ء-۱۳۷۸ھ) میں اس نے اپنی قابل رشک اور بے نظیر استعداد کی بنیاد پر فارسی ادبیات میں بی- اے کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی قانون کے مطابق ٹاپ کرنے اور پہلی پوزیشن حاصل کرنے والا لڑکا تعلیم کے لئے بیرون ملک بھیجا جاتا تھا- شریعتی پر بھی یہ قانون لاگو ہوتا تھا' لیکن اس امر میں اس کی سابقہ 'گویا سیاسی زندگی بڑی رکاوٹ بن رہی تھی' اور ملک کی انتظامیہ عرصہ دراز تک

اسے باہر جانے اور اپنے قانونی حق کو استعمال کرنے سے روک رہی تھی' لیکن بالآخر حکومت اپنے قانون کے آگر ٹھہر نہ سکی اور علی شریعتی نے ۱۳۳۹ شمسی (۱۹۶۰ء-۱۳۸۰ھ) کے ابتدائی حصے میں فرانس کا سفر اختیار کیا- تعلیم سے فراغت اور اس سفر کے درمیانی فاصلہ میں جو دو سال کے عرصے پر مشتمل ہے اس نے اپنی کلاس کی ایک لڑکی "خانم پوران شریعت" سے رشتہ ازدواج جوڑا- اس مناکحت کا ماحصل تین صاحبزادیاں اور ایک صاحب زادہ تھا-

پیرس یونیورسٹی میں

پیرس یونیورسٹی میں اسے اس بات کا موقع ملا کہ وہ آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کرے اور ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کرے جو اس کے ملک میں کمتر دستیاب تھیں- (بلکہ کبھی ایسے چہروں سے بھی اسے وہاں آشنا ہونا پڑتا تھا جو مسخ شدہ تھیں) نیز اس بات کا بھی وہاں اسے موقع ملا کہ وہ سماجی اور فلسفی مکاتیب کو براہ راست سمجھے' ان کا جائزہ لے' وہاں کی سماجی روش اور کردار کا مطالعہ کرے اور برگسن' آلبر کامو' سارتر' شوارتز' جیسے دانشوروں' فلسفیوں' لکھنے والوں اور گورویچ اور برگ جیسے معاشرتی علوم کے ماہروں اور لوئی میسینیون جیسے اسلام شناسوں سے آشنائی حاصل کرے اور ان کے افکار و آثار سے اپنا رشتہ برقرار رکھے- یہاں اسلام شناسی سے متعلق کتابوں نے عام طور پر اور سماجی علوم کے آثار نے خاص طور پر اس کی توجہ اپنی

طرف منعطف کی بلکہ اس نے اعلیٰ سطح پر اس کی تعلیم حاصل کی اور ہر چیز سے پہلے فرانس کے معاشرتی علوم سے متعلق تنقیدی اور تجزیاتی مکتب نے اس پر بہت زیادہ اثر مرتب کیا۔ لیکن اس کے لئے کہ جو سماجی شناخت کو فکرو عمل کی ایک ترکیبی شناخت کے عنوان سے جانتا تھا نہ یہ بات مطمئن کرنے والی تھی کہ سماجیات ایک علم مطلق ہے اور نہ خالصتاً مارکیسٹی تاثرات' اس لئے کہ ان میں کوئی بھی "غیر صنعتی" یا تیسری دنیا کے موجودہ واقعیتوں کو نہ پرکھ سکتا ہے اور نہ تجزیہ کر سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس علم الاجتماعی کی جستجو میں تھا کہ جو کیمونسٹی اور سرمایہ دارانہ معاشرے کے انقلاب اور وضعیت سے صرف نظر ان لوگوں کی زندگی کے حقائق کا کہ جن کے استعمار پر یورپی کیمونسٹوں تک نہ دستخط کئے ہیں' لیکن وہ لڑائی سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں اور اپنی عزت اور آبرو کے لئے لڑتے رہے ہیں تجزیہ اور تفسیر کر سکے۔

فرانس پہنچ کر علی شریعتی کی ملاقات ان دوستوں سے ہوئی جنہوں نے ایران۔ یورپ قومی تحریک کے عنوان سے پوشیدہ طور پر ایک مختصر گروہ کی تشکیل کی تھی جو وقفے وقفے سے چھپی ہوئی سیاسی باتوں کا راز افشاں کرتی تھی۔ مگر جب ایران میں قومی مبارزاتی تحریک کامیاب ہوئی اور دوسرے قومی محاذ نے باضابطہ طور پر اپنے کام کا آغاز کیا تو علی شریعتی اور ان کے دوستوں کے گروہ نے بھی ملک سے باہر کھل کر اپنی جدوجہد شروع کی اور اپنی مسلسل کوششوں سے ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء کو امریکہ کے قومی محاذ اور

اسی سال مئی میں یورپ کے قومی محاذ کی بنیاد رکھی۔

یورپ کے قومی محاذ پر مبنی کونسل کے قیام کے بعد اس محاذ کی تنظیم کے رسالے کی طباعت کا کام علی شریعتی کو سونپا گیا۔ علی شریعتی نے اس رسالے کی علمی اور فکری جہت کے لئے بہت اہم اور قابل قدر افراد کا انتظام کیا اور اس طرح "ایران آزاد" ماہنامے کا پہلا شمارہ ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو منظر عام پر آیا۔

علی شریعتی کہ جو اسی زمانے میں الجزائر کی تنظیم آزادی اور اس کے "المجاہد" نامی رسالے کے ساتھ قریبی اور ہمہ گیر اشتراک رکھتا تھا اس بات کا متوقع تھا کہ ایک دن "ایران آزاد" ، "المجاہد" کی طرح ایران کی خلق پارٹی کی تحریک آزادی میں تعمیری کردار ادا کرے گا۔ یہ وہ واحد رسالہ تھا کہ جو خلق کے مبارزات کو بہترین ممکنہ انداز میں اس کے پورے ابعاد کے ساتھ منعکس کرتا تھا۔ شریعتی نے اپنے تمام مسلمان بھائیوں کے ساتھ ان کے قدم بہ قدم، کمالِ صداقت و خلوص کی منزل میں اپنی پوری طاقت اور پوری کوشش کو بڑی سچائی سے قومی محاذ کے پھیلاؤ کی راہ میں اور بیرون ملک ایک ایسے مقتدر قومی تنظیم کی صورت میں ڈھالنے پر صرف کیا جو احتمالاً تیسری دنیا میں زیادہ وسیع سطح پر جدوجہد کر سکے۔ اور بہت سی طلباء تنظیمیں، خواہ وہ ملکی سطح پر ہوں یا برّاعظمی سطح پر یا پھر عالمی سطح پر ان ہی بھائیوں کی ہمت سے جن میں علی شریعتی بھی شامل ہیں قائم ہوئیں۔ اور

جس زمانے میں علی شریعتی اور ان کے احباب پیرس میں تھے' فرانس میں ایرانی طلباء تنظیم' ساری تنظیموں میں سب سے زیادہ سرگرم تنظیم تھی- وہ کبھی تھک کر نہیں بیٹھا' اس کے پاؤں کبھی نہیں اکھڑے-

اس نے صرف اور صرف خدمت کی غرض سے اپنا کام جاری رکھا- لیکن بہت سے نام نہاد قومی کارکن جو ستیزہ کار ہونے کے بجائے سیاسی ہوا کا رخ دیکھنے والے تھے ایران میں امریکی سیاست کی تفسیر کے فہم وادراک کے بعد اس احتمال کو سامنے رکھتے ہوئے کہ کہیں یہ آزادی حکومت کے خاتمے کا سبب نہ بنے انہوں نے اس اصیل قومی سیاسی حرکت کی توسیع وترقی کو اپنے لئے ناقابل برداشت جانا اور اپنا کام دکھانا شروع کیا' اور اس قدر رکاوٹیں ڈالیں اور روڑے اٹکائے کہ علی شریعتی کو مجبوراً اس ایرانی رسالے کی اشاعت کے امور سے دست بردار ہونا پڑا اور اس نے کہا' میں اس قومی محاذ کے بے فیض پیکر اور ہر طرح کے رنگ برنگے آدمیوں کی بھیڑ سے تنگ آگیا ہوں' اب اس کے ساتھ میرا تعاون بے معنی ہے- اس لئے کہ اگر ہم ان بداعمالیوں کے آگے سختی سے کھڑے نہ ہوں تو کبھی' نہ کوئی شخصیت بن سکتے ہیں' نہ ہماری بات کا کوئی وزن ہو سکتا ہے اور نہ ہم کسی نادرستی یا بد عملی کی راہ روک سکتے ہیں-

اس کے بعد علی شریعتی نے اپنے آپ کو الجزائر کے عوام اور ان کی آزادی کی تحریک سے منسلک پایا اور الجزائر کو فرانس کے استعمار سے آزادی

دلانے کی خاطر روزنامہ "المجاہد" سے تعاون کے ساتھ اس محاذ کی تنظیم کا آغاز کیا- اور اسی دوران وہ "فرانتز فانون" اور "عمر اوزیغان" سے آشنا ہوا- نیز ایک بار اس کا سامنا فرانس کی متشدد پولیس سے ہوا اور اس نے اپنے حملے میں اس کے پیر توڑ دیئے جس کے نتیجے میں وہ تین ہفتے ہسپتال میں رہا-

انقلاب الجزائر اس آشوب اور ان مثبت اور منفی مزاحمتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے تھا جن کو مختلف گروہ، مختلف جماعتیں، مختلف پارٹیاں، طلباء، یہاں تک کہ یورپ کے ماہرین سماجیات اور دانشور حضرات ان مسلمانوں کی سرنوشت کی نسبت جو ایک صدی سے زیادہ فرانسیسی استعمار کے زیر تسلط تھے اور اب انہوں نے ہولناک جہاد اور موت و حیات کی جنگ شروع کی تھی، روبعمل لائے ہوئے تھے، اور اس بیچ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی اور خاص طور پر الجزائر کی کمیونسٹ پارٹی کا کردار کہ جو فرانس سے الجزائر کی وابستگی کی تائید کر رہی تھی مگر انقلاب کی تائید نہیں کر رہی تھی اور ڈاکٹر خاص دلچسپی کے ساتھ ہر کسی سے زیادہ ان واقعات میں تعمق و تفکر کر رہا تھا، وہ اپنے آپ کو مسلمان ممالک کی استعمار دشمن تحریکوں سے الگ نہیں سمجھ رہا تھا بلکہ ان سب کی سرنوشت میں خود کو شریک سمجھ رہا تھا-

بہر حال الجزائر کے خونی انقلاب کی بات کچھ ایسی تھی کہ جس نے "اپنوں" اور "غیروں" کو اپنی طرف متوجہ کر دیا تھا- اس لئے کہ اس

وقت تک استعمار دشمن انقلاب کی صورت یہ نہیں تھی کہ وہ اتنی وسعت اور اتنے پھیلاؤ کے ساتھ کہ جو دس ملین مسلمانوں کو الجھادے اور ایک ملین شہید چھوڑے اور کاشتکاروں' "پہاڑی لوگوں" اصطلاحاً مقامی مسلمانوں کو عظیم ترین استعماری لشکر کے مقابل لے آئے اور پھر دشمن کی واپسی کا راستہ روک دے اور آخر کار اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے۔

عبرت انگیز بات یہ تھی کہ ساری حق طلب مسلمان قوتیں وہ دنیائے عرب میں ہوں یا کہیں اور اس تحریک میں شامل تھیں اور اس کو اپنے وجود میں محسوس کرتی تھیں۔ ہر کوئی اسے اپنی تحریک سمجھتا تھا۔ الجزائر کے حریت طلب محاذ کے حکم پر مسلمان طلباء نے حتیٰ ان طالب علموں نے بھی جو ڈاکٹری' پولی ٹیکنیک' اور دوسرے سبجیکٹس کے آخری سال میں تھے اپنی تعلیم چھوڑ کر مجاہدوں کی صف میں شمولیت اختیار کی تھی۔ تحریک کے تمام منصوبوں پر دنیا بھر میں ساری مسلمان قوم کے ہر مقام اور ہر منصب کے لوگوں نے اپنی چاہت سے کھل کر عمل کیا' یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں تک نے اس لڑائی میں حصہ لیا اور ہر کسی نے اپنی وسعت کے مطابق اس کی مدد کی اور اسے کمک فراہم کیا۔

اس تحریک کا ایک اور بُعد وہ افکار و نظریات تھے جو رونما ہو رہے تھے۔ تحریک کے گہرے عوامل کے ادراک و افہام کے لئے ملک کے اندر اور باہر فلسفی' سماجی اور نفسیاتی تجزیے عمل میں آرہے تھے اور مختلف زبانوں

میں کتابوں اور مقالوں کی صورت میں ان کی اشاعت ہو رہی تھی۔اس سلسلے میں جس طباعت کو امتیاز حاصل تھا وہ فلسطینی تنظیم کا یہی "المجاہد" نامی رسالہ تھا۔ وہ ٹکراؤ کی صورتحال کو بہترین انداز میں پیش کر رہا تھا۔ فرانسیسی روشن خیال لوگ بھی ان فکری تحریکوں کو وافر انداز میں کمک پہنچا رہے تھے۔ ان میں فرانتز فانون کے آثار اور مقالوں نے جو دراصل مارتینیک کا رہنے والا تھا اور اس نے الجزائر کی قومیت لے لی تھی اور پیشہ کے اعتبار سے ماہر نفسیات تھا ہر کسی سے زیادہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی۔وہ کہ جو شروع ہی سے الجزائر کے حریت طلب محاذ میں شامل ہو گیا تھا ہمیشہ رہنے والے عظیم آثار کا حامل ہے جس میں "زمین کے دوزخی لوگ" اور "انقلاب الجزائر کا پانچواں سال" جیسی کتابیں شامل ہیں۔

فانون کو کہ جسے سارتر نے اہل یورپ کو متعارف کرایا تھا پہلی بار ۱۳۴۱ شمسی (۱۹۶۲ء - ۱۳۸۲ھ) میں ڈاکٹر علی شریعتی نے ایران کے ایک سیاسی۔ سماجی رسالے کے ذریعے یورپ میں مقیم ایرانی طلبہ کے سامنے شایان شان طریقے سے پیش کیا۔ فانون کی "زمین کے دوزخی لوگ" (یا بقول ڈاکٹر، مغضوبین زمین) نامی کتاب ان گہرے سماجیاتی اور نفسیاتی تجزیوں کے ساتھ کہ جن کا تعلق الجزائر کے انقلاب کی مناسبت سے تھا، ایرانی مجاہدین اور مبارزین کے لئے بڑا اچھا تحفہ تھا۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے اس کے ان نظریات کو پیش کر کے کہ جو تقریباً

سبھی ناشناختہ تھیں اور اسکی کتابوں کے بعض حصوں کے ماخوذ نتائج کا ترجمہ کر کے اس کے افکار و خیالات کو ایران کی اس قومی تحریک تک پہنچایا جس کا وہ بھی حصہ تھا' اس کے مضمون میں مسلسل اس بات کی تکرار ہوتی تھی :

"دوستو آؤ' یورپ سے کنارہ کریں' دوستو آؤ ان بوزینہ صفت تقلیدوں سے دست بردار ہو جائیں- آؤ ان یورپ والوں کو جو ہمیشہ انسان کی ہانکتے ہیں لیکن جہاں کہیں انسان کو پاتے ہیں.... اس کا پتّا صاف کر دیتے ہیں' چھوڑ دیں..."

اس طرح فانون ان قدروں کے ساتھ جنہیں اس نے پیش کیا تھا اور اس تعارف کے ساتھ جو اس کی نسبت عمل میں آیا تھا' خاص طور پر اس قلم سے جو اس کا ہمدرد تھا اور اس کی کہی ہوئی باتوں کو اپنی روح کی گہرائی میں محسوس کرتا تھا لوگوں کے استقبال اور توجہ کا مرکز بنا اور کچھ اور صاحب نظر لوگوں نے بھی اس کے بعد اس کے مزید تعارف اور کتابوں کے ترجموں پر توجہ دی...

اسی طرح ڈاکٹر علی شریعتی کا افریقہ کے تمام سماجی اور انقلابی مفکروں کی سوچ کو متعارف کرانے میں بہت بڑا حصہ رہا ہے جن میں "عمر اوزگان" ("افضل الجہاد" نامی کتاب کے مصنف) اور غیر مسلمان افریقی شعراء اور نثر نگار حضرات بھی شامل ہیں- جن افکار نے افریقہ کی دینی اور قومی تحریکوں کو جلا بخشی وہ ایران کے سیاسی اور سماجی حالات کو بھی ایک تازہ فکری

اٹھان دے سکتی تھیں، بس یہی ایک آدمی تھا کہ جو اپنے دوستوں اور طالب علموں کو اپنے زمانے کے مجاہدین کی حقیقی تحریکوں سے فکری توشہ حاصل کرنے کی ہدایت کرتا تھا... القصہ یورپ میں لکھنے والوں، سوچنے والوں اور صاحبان فکر و نظر کے آثار و افکار کے مطالعے اور ان کے ساتھ میل جول نے منفی اثرات سے زیادہ اس پر مثبت اثرات قائم کئے اور اس کی جدوجہد، خلاّقیت، اور تازہ افکار میں اضافہ کیا- ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قومی شناخت کے میدان میں اپنے حقیقی درس کو سماجیات کے رائجہ اور کلاسیکی کمیت پر منحصر کرنے سے زیادہ اسے قوموں کی حقیقی تحریکوں اور ان کے زندہ آثار سے وابستہ کرتا تھا، اور اپنے عینی تجزیوں اور مطالعات کو تنقید کے عمل سے گزارے بغیر کام میں نہیں لاتا تھا- اس طرح پیرس میں اپنی اقامت اور تعلیم کے دوران جہاں اس نے سماجیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، وہ پڑھنے، یاد کرنے اور امتحان دینے سے زیادہ یعنی یونیورسٹی کے طلباء کی عام روش کو اختیار کرنے سے زیادہ، ایک آگاہ، دقیق اور مجاہد طالب علم کی حیثیت سے عمل کی منزل میں رہا، اور یہی بات اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی وجہ تمایز بنی، اور اسی صفت نے اسے دوسروں سے ممتاز کیا-

در حقیقت اس کے فکری مجاہدے، علمی جہاد اور سچے تعلیم و تعلّم پر مبنی کوششوں اور فعّالیتوں سے متعلق، تین ابعاد نے اس کو ہر کسی سے ممتاز کر دیا تھا، خاص طور پر ان تمام مجاہدات کی جہت، لوگ اور وسیع تر مفہوم میں

"امت مسلمہ" تھی-اس کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس پُر آشوب دور میں قبل اس کے کہ سیاسی اور متعلمی غل ختم ہو جائے' اپنے لوگوں کے لئے کوئی بنیادی اور مفید کام انجام دے-اس مقصد کے لئے اس نے قلم کا سہارا لیا اور ہر ممکن کوشش کی' اور ہر کسی سے زیادہ لوگوں کے "باطن" پر تکیہ کیا اور اس پر توجہ دی اور کسی چیز کو اس کی جگہ نہیں دی اور اسکا جانشین نہیں بنایا-

اس کے آثار کا مطالعہ اس کی پہلی کتاب سے لے کر آخری کتاب تک' اس کے مقصد' اس کی سمت (وہ بھی ایک واحد مقصد اور واحد سمت)' اس کی استقامت اور اس کی تغیّر ناپذیری کو مجسم کرتا ہے' اور اس کے بے شمار گواہوں میں سے ایک گواہ اس کی "دو شہید" نامی کتاب ہے-جس کے پہلے شہید کو اس نے اس وقت لکھا جب وہ مڈل اسکول کا طالب علم تھا اور دوسرے شہید کو اس وقت لکھا جب اس کی زندگی کا چراغ بجھنے والا تھا-

یاد رہے کہ فرانس میں اس کی اقامت کا دور اس زمانے سے متصل تھا جب اس کے دیس میں مذہبی تحریک جنم لے رہی تھی' بہت کم عرصے میں جب آزادی کی لہر ابھری تو طاقت اور دباؤ کے استعمال نے پھر اپنی گذشتہ کی جگہ لے لی اور گرفتاریوں' مقدمہ بازیوں' لمبی سزاؤں اور وحشیانہ سلوک کا سلسلہ شروع ہوا' اور اس کے زیادہ تر شکار مذہب پرست اور معتبر دیندار لوگ تھے اور ان کے ساتھ آزادی کی وہ تحریک بھی تھی کہ جو ہر گروہ سے زیادہ آئیڈیالوجی' روشن سیاست اور مثبت اور قاطعانہ عمل کے ساتھ میدان

میں کود پڑی تھی' ان سب کے ساتھ حکومت نے انتہائی ظالمانہ سلوک کیا۔ اور پھر ۱۲ محرم کے شاندار قیام نے اس داخلی تحریک کو ایک نیا رنگ دیا اور حقیقی مجاہدین کو "موسمی مظاہرین" سے مکمل طور پر الگ کر دیا۔

وہ کہ جو اس تحریک سے وابستہ تھا اور اس تحریک کو اپنی تحریک سمجھتا تھا ایک لمحے کے لئے بھی حقائق کو لکھنے' بولنے اور دینی تحریک کے تجزیے سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب غیر ملکی مطبوعات کا بیشتر مواد غیر مذہبی اور بعض' مذہب دشمن رنگ لئے ہوئے تھا جبکہ یہ ایک دینی سماجی تحریک تھی اور اس کی بنیاد کو ایک ترقی پسند مذہبی فکر تشکیل دے رہی تھی' بہر حال اگر اس کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے تو یہ بد نیتی اور خاموش سازش ہو گی' یہ ایک تجاہل و تغافل تھا کہ روشن خیال لوگ سماجی حقائق اور اس تحریک کے پاس سے گزر رہے تھے اور صرف اخبار کی خبروں پر اکتفا کر رہے تھے یا تلویحاء اور اشارتاً اسے ایک تقصیر قرار دے رہے تھے۔

یہ وہی دن تھے جب یورپ کا مقبول ترین فارسی رسالہ علی شریعتی اور اس کے ہم خیال لوگوں کے محکم قلم سے نشر و اشاعت کی منزل پر تھا اور علی شریعتی نے اسے ایک موقر اور حقیقت پسند رسالے کی صورت دی تھی۔ یہ وہ منزل ہے کہ جہاں روشن خیال لوگوں اور عوامی اجتماعی تحریک کی سوچ کے درمیان حقیقی صورت میں ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ چونکہ فرانس میں تعلیم کے دوران اس کی سوچ اور اس کا عمل دونوں ساتھ ساتھ تھے اس لئے اس

نے اپنی حد تک بیرون ملک ایک موثر فکری حقیقت کو ایرانی طلباء کے درمیان اجاگر کیا۔

یہ گفتگو یا یوں کہیے یہ اشارات علی شریعتی کے مجاہدات کے پھیلے ہوئے دامن کا صرف ایک حصہ ہے جسے اس مفکر مجاہد نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے اب ایک ذہین قاری خود اس مجمل سے مفصل تک پہنچ سکتا ہے۔

مگر ابھی تک بات ختم نہیں ہوئی، علی شریعتی نے برسوں کی تحصیل و تحقیق اور صاحبان مکاتیب، مفکر اور آزاد اندیش، قابل و لائق اساتذہ کے محضر درس سے استفادہ کرنے کے بعد جب سوربن یونیورسٹی سے سماجیات اور تاریخ اسلام میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور واپس وطن لوٹے تو، ملک سے باہر اس کی جدوجہد کے نتیجہ میں ایئرپورٹ ہی سے اسے جیل لے جایا گیا مگر پھر ۶ ماہ بعد حکومت نے لوئی مسینیون، شواتز، مارتر، ھنری لومز اور ان جیسی بہت سی شخصیتوں کے اعتراض کے سبب اسے چھوڑ دیا گیا، اور وہ اپنے شہر خراسان واپس لوٹا اور دانشگاہ مشہد میں تدریس پر مامور ہوا۔

اس کی ساری کوششیں، قومی ثقافت کی قدروں سے طلباء کو آگاہ کرنا اور ان کو ان کی ذمہ داری اور کردار سے آشنا کرنا تھا۔

۱۳۴۸ شمسی (۱۹۶۹ء - ۱۳۸۹ھ) کو جب "حسینیۂ ارشاد" اسلامی ثقافتی مرکز کے عنوان سے منظر عام پر آیا تو ڈاکٹر علی شریعتی کی کوششوں کا آغاز ہوا اور اس نے وہاں تاریخ ادیان اور اسلام شناسی

پر اپنے لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا-اس عرصے میں اس نے ایک طرف سے تاریخ ایران' تاریخ عالم اسلام اور مقدس چہروں اور بڑی شخصیتوں کے بارے میں جستجو اور کاوش کی اور دوسری طرف سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے وطن کے موجودہ معاشرے کی زندگی' ان کی کمزوریوں' ان کی خستہ حالیوں' ان کی پریشانیوں اور ان کے انحطاطی پہلوؤں کے اسباب و علل کی توجیہ کی اور کوشش کی کہ لوگوں کو خاص طور پر نوجوان نسل کو اپنی سرزمین کی دردناک واقعتیوں سے آگاہ کرے- مگر حکومت کا عملہ نہ "حسینیۂ ارشاد" کو برداشت کر سکا اور نہ اس کے ساتھ علی شریعتی کے تعاون کو- ابتداء میں اس نے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے بڑی کوششیں اور بڑے جتن کئے اور تنخواہ دار زر خرید لوگوں کے ذریعے حسینیہ ارشاد اور ڈاکٹر علی شریعتی کے خلاف افواہیں پھیلانی شروع کیں مگر جب ان کے نشانے ہر طرف سے خطا ہو گئے تو انہوں نے خود فروختہ صاحبان فکر و نظر اور امریکی اور غیر امریکی مارکسسٹوں کے ذریعے کہ جو علمی تحقیقی فن کے مبتکر اور متولی تھے اور جنہوں نے ڈاکٹر کورش لاشائی' نیکخواہ' روزنامہ رستاخیز کے مدیر اعلی ڈاکٹر مہدی سمسار اور کیھان اخبار پر مسلط کردہ مدیر اعلی "امیر طاھری" جیسے ہم خیال لوگوں کو شیشے میں اتارا ہوا تھا اور ان کے ذریعے وہ ہر روشن خیال اور مفکر کو کیچڑ میں گھسیٹتے تھے' علی شریعتی کو آڑے ہاتھوں لیا-

اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے بد گوئی' یاوہ سرائی' افواہ تراشی اور تہمت زنی وغیرہ سے کام لیا اور کچھ لوگوں کو اس کام پر لگایا کہ وہ اسے بہائی' اسلامی مارکسسٹ' وہابی' حتیٰ لادین کے عنوان سے مورد الزم ٹھہرائیں۔اس آگ کو دائیں اور بائیں بازو کے لوگوں نے مل کر ہوا دی اور کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

لیکن جب ساواک کے سامنے یہ بات آئی کہ یہ سازش بھی علی شریعتی کے قدم اکھاڑنے پر قادر نہیں تو انہوں نے ایک نیا منصوبہ بنایا اور اس کو عمل میں لانے کے لئے حسین زادہ' کرنل دھدشتی' احسان نراقی' پرویز ثابتی' نیکخواہ' ابراہیم خواجہ نوری اور سید مرتضیٰ جزائری وغیرہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تاکہ بقول ان کے وہ علمی انداز میں علی شریعتی سے رو برو ہوں۔

ان لوگوں نے اپنے اعتراف کے مطابق بنیاد کو علی شریعتی کی مٹی پلید کرنے پر رکھی تھی۔چنانچہ انہوں نے دانشگاہ مشہد میں انسان اور کائنات سے متعلق مختلف احساسات پر مبنی علی شریعتی کے ایک بہت پرانے متن کو جھوٹ کے پلندے کیہان اخبار کو طباعت کے لئے دیا۔

چونکہ یہ مضمون بہت پرانا تھا اور حسینیہ سمیت سارے دانشگاہوں میں شریعتی کے نئے اور منظم آثار سے واقف طلباء اس متن سے بے خبر تھے اس لئے وہ اس منظم منصوبے کے تحت تیار کردہ تاثرات میں اسے بالکل نئے رنگ میں دیکھ رہے تھے اور پھر یہ اس خوبی سے مرتب کیا گیا تھا کہ

بعض مطالب کی کمی بیشی اور بعض اشتعال انگیز عناوین بھی علی شریعتی کے لہجے، زبان اور انداز کو متاثر نہیں کر رہے تھے اور ناواقف افراد بلکہ علی شریعتی کے طلباء کے لئے بھی ظاہراً یہ بات محل تردید نہیں بن رہی تھی کہ یہ نئی باتیں علی شریعتی ہی کی ہیں اور اس نے خود از روئے تعاون اسے کیھان اخبار کے حوالے کیا ہے۔

اس طرح انٹیلیجنس اور ان کے عہدے داروں نے سمجھا کہ انہوں نے اپنی سب سے بڑی سیاہ کاری کو انجام تک پہنچادیا ہے اور اس بلند ہمت اور اعلیٰ صفات انسان کو "کیھان" کی پلیدی سے ناکردہ گناہ میں ملوث کر دیا ہے۔

یہ چوٹ بڑی سخت اور ہولناک تھی اگر خدا اور خلق، اس خدا یا خلق کے دوست کی مدد کو نہ آتے تو خونخوار حکومت بڑے آرام سے اپنا کام کر جاتی اور وہ سب سے بڑی ٹھیس جو اس کو پہنچائی جاسکتی تھی پہنچا دیتے، شریعتی کے شاگردوں اور دوستوں نے حقیقت جوئی کی راہ میں بہت درست اور بر محل اقدام کر کے حکومت کی اس مکّارانہ اور شیطانی چال کو باطل کر دیا۔

مگر اب جب ان کے جتن بے کار گئے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ حسینیہ ارشاد کے دروازے بند کر دیئے اور علی شریعتی پر سختیاں شروع کیں اور اس کی زندگی اتنی ضیق کر دی کہ اس کا سانس لینا دوبھر ہو گیا، چنانچہ اسے روپوشی اختیار کرنی پڑی۔ اب ساواک کی دوزخی تنظیم نے علی شریعتی کے بجائے ان کے والد بزرگوار کو گرفتار کیا تاکہ وہ مجبوراً اپنی گرفتار پیش کرے

اور ایسا ہی ہوا- علی شریعتی اپنے والد کی گرفتاری کی خبر سن کر تہران پہنچے اور اپنی گرفتاری دی-

بہر صورت ۱۳۵۳ شمسی (۱۹۷۴ء - ۱۳۹۴ھ) کے مہر ماہ میں اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور ۱۸ ماہ تک محبوس رہا اور انتہائی شدید تشدد کا نشانہ بنا- اس نے بے شرم و بے حیا زندانبانوں کے ناقابل تحمل عذاب کے گھٹنے ٹکوا دیئے اور ان کے کریہ چہروں پر عرق انفعال بٹھایا-

اسی زمانے میں جب علی شریعتی گرفتار ہوئے اور حسینیہ ارشاد کے دروازے بند کر دیئے گئے بڑی تیزی سے اس کی کتابوں اور تحریروں کو ہر طرف سے سمیٹا جانے لگا اور ان کا پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا جس کسی کے ہاتھ میں اس کی کتاب دیکھی جاتی اسے گرفتار کر لیا جاتا- لیکن جتنی سختی کی گئی اسی قدر لوگوں کی استقامت میں اضافہ ہوا- یہاں تک کہ اس کی کتابیں نہ صرف ایران میں بلکہ بیرونی ممالک تک میں پہنچیں- یہ کتابیں اس کی تقریروں کے ٹیپس کے ساتھ امریکی' یورپی اور عربی ممالک تک گئیں اور اردو' عربی' انگریزی' فرانسیسی اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے-

۱۸ ماہ بعد دنیا کے عمومی افکار' خاص طور پر الجزائر کی محاذ آزادی کے ارکان کے دباؤ تلے اسے رہا کر دیا گیا لیکن اس کے خلاف' شیطانی حکومت کی تدابیر بدستور جاری رہیں' اور ساواک کی پوری کوشش یہ رہی کہ اس کی زبان اور قلم پر پہرے بٹھا دیئے جائیں اور اسی لئے اس کو سختی سے

نظر بند کر دیا گیا اور اس کی ہر حرکت پر نگاہ رکھی گئی جب یہ دباؤ حد سے زیادہ بڑھا اور ایران میں اس کا جینا دوبھر ہو گیا تو بالآخر اس کے دوستوں نے ایران سے اس کی ہجرت کا منصوبہ بنایا- حاصل شدہ اطلاعات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ساواک کے رجسٹر میں حرف میم کی لسٹ میں "مزینانی" نام کا کوئی شخص ممنوع الخروج نہیں ہے اور اسی لئے ۱۲ اردیبہشت ۱۳۵۶ شمسی (۱۹۷۷ء - ۱۳۹۷ھ) کو علی مزینانی نے اپنی بیوی "پوران رضوی" کو یہ اختیار دیا کہ وہ بیلجیم میں اپنی آنکھوں کے علاج کی بنیاد پر اس کو ملک سے باہر نکالنے کے لئے پاسپورٹ تیار کرے-

جب پاسپورٹ تیار ہوا تو علی شریعتی اپنے خاندان سے ملنے کے بہانے تہران سے مشہد روانہ ہوئے اور ۲۶ اردیبہشت ۱۳۵۶ شمسی کو ایران کے "ساینا" نامی جہاز کے ذریعہ اس طرح بروکسیل روانہ ہوئے کہ ان کے والد تک کو ان کے ارادے کا علم نہیں ہوا- فلائٹ سے پہلے آخری لمحوں میں اس نے اپنے والد کو اپنے سفر کی کیفیت سے آگاہ کیا اور لکھا:

"میں اس وقت سفر کے عالم میں ہوں' اس سفر میں کہ جو خداوند عالم کا مکر ساز اعجاز ہے- میں نے اپنی کیفیت' آپ کے جذبات اور آپ کے اعصاب کو پیش نظر رکھا ہے- اب جبکہ اس وطن اور اس گھر میں میرے آخری لمحے گزر رہے ہیں میں آپ کی دست بوسی کرتا ہوں- آنے والے وقت میں مجھے آپ کا انتظار رہے گا-"

اس طرح خاموشی کے ساتھ وہ یورپ پہنچا اور حکومت ہاتھ ملتی رہ گئی۔ اس کے ساتھ اس کی ۱۴ اور ۱۵ سالہ دو لڑکیاں بھی تھیں جن کا پاسپورٹ اس نے مزینانی کے نام سے بنوایا تھا۔ اسے اپنی بیوی اور چھوٹی بچی کا انتظار تھا جنہیں وہ تہران میں چھوڑ آیا تھا۔ رات ہوٹل میں وہ ساتھ آئی ہوئی اپنی دونوں بچیوں کو دلاسا دیتا رہا کہ بہت جلد ان کی ماں اور چھوٹی بہن ان سے آملے گی اس کے بعد وہ ہوٹل کے دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا اور ایسا سویا کہ پھر نہ اٹھا۔ دشمن اپنی چال چل گیا مگر کس طرح اور کس بازی گری سے' یہ وہ معمہ ہے کہ جس نے علی شریعتی کے وجود کو ہالے کی طرح گھیر رکھا ہے۔

اتوار کی صبح جب یہ خبر عام ہوئی تو شہنشاہی حکومت نے اس کی بیوی کو ملک سے باہر جانے کی اجازت دی اور اس غریب الوطن کے جنازے کو صرف اس کے بچوں اور چند ایک دوستوں کے توسط سے شام میں زینبیہ کے مقام پر سپرد خاک کیا گیا اور اس طرح اس نے شیر دل خاتون جناب زینب سلام اللہ علیھا کے جوار اقدس میں ابدی جگہ پائی' اور ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو یہ نیر تاباں اس طرح غروب ہوا کہ پھر نہ ابھرا۔

(اس پورے واقعے اور اس پر بیتی ہوئی دوسری باتوں کو کسی قدر تفصیل سے آپ "ذکر اور ذاکرین" اور "توتم پرستی" نامی کتابوں میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔)

☆ ☆ ☆

آثار و افکار

علی شریعتی جو بھی تھا اور اس نے جو بھی کیا' اہم بات اس کے وہ آثار و افکار ہیں جسے اس نے ریکارڈ شدہ تقریروں' کتابوں' درسی کتابچوں اور متعدد آثار کی صورت میں چھوڑا ہے اور جو دس دس ہزار نسخوں میں کئی کئی بار چھپی ہیں اور نوجوان نسل بڑے اشتیاق اور والہانہ انداز میں ان کتابوں کی شیدائی ہے اور انکے گہرے اثرات کو کسی صورت بھی ان کے دلوں سے نکالا نہیں جاسکتا' اس لئے کہ اسکی گفتگو اور اس کی تحریریں انتہائی خلوص' صدق و صفا اور حقیقت سے ہمکنار ہیں اور ان میں غیر معمولی خلاقیت کا عنصر بھرا ہے: "پاکیزہ انسان کو نیز زندگی اور زمانہ تنہا نہیں چھوڑتا' اس کی زندگی اس کا دفاع کرتی ہے' زمانہ اس کی بیگناہی کی گواہی دیتا ہے- پلید اور بدسرشت لوگ ھرگز کسی پاکدامن انسان کو آلودہ نہیں کر سکتے ہر چند کہ پتھروں کو جکڑا اور کتوں کو چھوڑ دیا جائے..." (کویر)

"بازگشت بہ خویشتن" علی شریعتی کی وہ کتاب ہے جو "العودہ الی الذات" کے نام سے عربی میں ترجمہ ہو کر قاہرہ میں چھپی اور مصر میں اس کا فقید المثال استقبال ہوا اور مختصر عرصے میں اس کتاب کے ایک لاکھ نسخے مصر میں فروخت ہوئے اور مصر کی اسلامی تحریکوں کے حامیوں نے اس

کتاب کو پڑھنے اور اس کے لکھنے والے کے اعجاز آفریں تعارف سے وسیع پیمانے پر اپنی کارروائیاں شروع کیں۔ ۳۶۰ صفحوں پر مشتمل یہ وہ تیسری کتاب ہے جسے قاہرہ یونیورسٹی کے دانشکدہ ادبیات سے وابستہ مشرقی زبانوں کے پروفیسر جناب ابراہیم الدسوقی نے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ دوسری دو کتابوں میں ایک کتاب "خود سازی انقلابی" ہے اور دوسری کتاب "روشن فکر و مسئولیت او در جامعہ" ہے جو کئی بار چھپی ہے۔

علی شریعتی نے اس کتاب میں اپنے خاص انداز سے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ ہمارا تکیہ اسی اسلامی ثقافت پر ہے اور ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی طرف اپنی اسی بازگشت کو اپنا شعار بنائیں اس لئے کہ یہ وہ واحد قرابت داری ہے کہ جو سب سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ وہ واحد ثقافت و تمدن ہے جو ابھی زندہ ہے اور وہ واحد روح حیات و ایمان ہے جو اس موجودہ معاشرے میں کہ جس میں روشن خیال آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل کی منزل میں آئے اور کام کرے' حیات اور تپش کا حامل ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ ہم اسلام کو تکراری صورت اور ان ناآگاھانہ رسم و رواج سے کہ جو انحطاط کا سب سے بڑا سبب ہے نکال کر اسے ایک معترض ترقی پسند آگاہی دینے والے اسلام اور روشنی سے ہمکنار کرنے والی آگاہی بخش آئیڈیالوجی کی صورت میں پیش کریں' تاکہ یہ آگاہی جو اپنی سمت بازگشت اور اپنے سے شروع کرنے کے لئے مذہبی یا غیر مذہبی روشن خیال آدمی کی ذمہ داری

ہے عمیق ترین معنوی واقعیت اپنی اس حقیقی انسانی شخصیت کی بنیاد پر کہ جو زندہ ہے اور معاشرے میں موجود ہے قائم رہے اور اس سرمایہ سے فیض اٹھا کر اپنے پیروں سے پر کھڑا ہو جائے اور اس تبدیلی کے ساتھ اسلام' سماجی رسم و رواج کی صورت سے ایک آئیڈیالوجی کی صورت میں' اس علمی معارف کے مجموعے کی صورت سے جو درساً درساً پڑھائی جاتی ہے ایک خود آگاہ ایمان کی صورت میں اور ان شعائر' علائم اور اعمال کی صورت سے جو صرف اخروی ثواب کے لئے عمل میں آتی ہیں ایک ایسی بڑی طاقت کی صورت میں رونما ہو کہ انسان کو مرنے سے پہلے ذمہ داری' حرکت اور جانبازی کا رجحان بخشے اور ایک ایسے عظیم مادّے کے اخراج کا عنوان بنے جو اس روشن خیال معاشرے کو عشق و آگاہی دے اور پرومتہ کے معجزے کو اس نسل میں وارد کرے اور وہ اعجاز نمودار ہو کہ جو آگاہی اور ایمان سے نمودار ہوتی ہے اور پھر جمود اچانک حرکت میں' جہل اچانک آگاہی میں' اور یہ کئی صدیوں کا انحطاط اچانک ایک قیامت خیز حرکت اور انقلاب میں تبدیل ہو جائے اور اس صورت سے (مذہبی اور غیر مذہبی) روشن خیال آدمی بھی اپنی طاقتور زندہ انسانی خود آگاہ ذات میں واپس آئے اور مغرب کے ثقافتی استعمار کے مقابل ڈٹ کر اپنے معاشرے کو کہ جو مذہب کی طاقت کے ذریعے بے خبری کا شکار ہو رہے ہیں مذہب کی طاقت سے آگاہ کرے اور انہیں حرکت میں لائے اور معنوی تخلیق کار انسان کے روبرو کھڑا کرے۔

اور پھر تمدن و ثقافت اور معنوی شخصیت کو بر قرار رکھنے والی نسل کی صورت میں بھی باقی رہے اور نیز ہر کوئی اس پرومتہ کے روپ میں بھی جلوہ افروز ہو کہ جس نے زمین کے ٹھڑے ہوئے لوگوں کے لئے آسمان سے خدائی آگ اتاری۔

ڈاکٹر دسوتی نے اس کتاب کے ترجمہ پر ایک مختصر وضاحت کے ضمن میں ڈاکٹر علی شریعتی کو "عظیم روشن خیال' حقیقت اور سچائی کی طرف دعوت دینے والے عصر حاضر کی اسلامی فکر کے پیام آور' اور ایران کے کامیاب انقلاب کے نظریہ پرداز" کے عناوین سے یاد کیا ہے اور علی شریعتی کی فکر کو ایک "مقامی فکر" نہیں بلکہ ایک ایسی فکر جانا ہے جو تیسری دنیا یا اس کی پسندیدہ تعبیر میں پوری "دوسری دنیا" کے لئے ہے۔ اس نے ایسے مسائل پر گفتگو کی ہے جو آج کا موضوع ہے۔ اور جس پر دنیا کے اس حصے کے تمام مفکرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مترجم بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ "یہ کتاب پڑھنے والے کے ذہن میں ایسے مسائل کو ابھارے گی جو اسے مدتوں دکھ دے گی اور حیرت میں مبتلا کرے گی اور جو بت اس کی نگاہوں کے سامنے براجمان تھے اور مدتوں سے اس کے افق نگاہ کو روکے ہوئے تھے ٹوٹ کر گر پڑیں گے اور اس کتاب کو پڑھنے کے بعد وہ اپنے آپ کو مشتعل تر مگر روشن تر فکر و نظر کے ہالے میں پائے گا۔

ڈاکٹر دسوقی نے علی شریعتی کی "کویر" "خود سازی انقلابی" "بازگشت بہ خویشتن" ، "پدر و مادر ما متھم ہستیم" ، "اسلام شناسی" اور "روشن فکر و مسئولیت او در جامعہ" جیسی کتابوں سے استفادہ کر کے مذکورہ کتاب پر دس صفحوں کا مقدمہ "علی شریعتی : زندگی اور سوچ" کے عنوان سے لکھا اور علی شریعتی کی زندگی اور اس کے افکار پر ایک کلی صورت' مصری پڑھنے والوں کے حوالے کی۔

--ڈاکٹر علی شریعتی کے منفرد انداز تحریر اور نامنصفانہ اور ظالمانہ بشری تقسیم کے خلاف ان کے ذہن رسا کی فلک پیمائیوں' ان کے توسن فکر کی جولانیوں اور ان کے سمند قلم کی تاخت و تاز کو دیکھنا ہو تو آپکو "آری دوست این چنین بود" سے بہتر کتاب نہیں ملے گی۔ یہ کتاب نوع بشر کے سرمایہ افتخار' تاریخی آثار کے بارے میں لوگوں کی سوچ کو دگرگوں کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ تقریباً ایک ہزار کیلو میٹر سے ڈھائی ٹن وزنی سلوں کو ڈھو کر ۴۸۰ فٹ کی بلندی پر پہنچانے والے ہاتھ کتنے قوی اور توانا تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ کتنے بے اہمیت بھی تھے کہ تاریخ ان کے ناموں تک سے واقف نہیں ہے۔ غرض یہ کہ اس نے اس کتاب میں پانچ ہزار سال سے زندہ تاریخ کے مستضعفین کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے جسے پڑھ کر اہرام مصر سے لے کر تاج محل جیسے تاریخی آثار کے معماروں اور انہیں وجود میں لانے والے محنت کشوں کے کام کی اہمیت و عظمت اور انسانی

سماج میں ان کی شخصیتی حیثیت کے ناچیز پن کا اندازہ ہوتا ہے۔

مذکورہ کتاب کی طرح اس کتاب کا استقبال بھی مصر میں بڑی دھوم دھام سے ہوا اور اس کے بھی ایک لاکھ نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے اور اس پر فلم بھی بنی۔

اس عظیم انسان کی تحریریں خود اس کے کہنے کے مطابق تین شعبوں اسلامیات' سماجیات اور کویریات (دشتیات) میں تقسیم ہوتے ہیں۔ کویریات یا دشتیات میں اس کی دو کتابیں بہت اہم ہیں اور ایران کا ہر لکھنے والا عرفانی موضوع میں ان کتابوں کی تحریروں کو کہیں نہ کہیں کوٹ کرتا ہے۔ علی شریعتی کے والد محترم محمد تقی شریعتی سے ان کے نامدار فرزند کی کتابوں میں ان کے نقطہ نظر سے بہترین کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

"حسین وارث آدم" بہت عمیق اور گہری کتاب ہے "شہید بعد شہادتش" (شہید بعد شہادت) بہت پرکشش اور عمدہ کتاب ہے اور اسی طرح "یاد و یاد آوران" (ذکر اور ذاکرین) بھی اس سے کچھ کم نہیں' مگر کویر (دشت)، قلم اور تحریر کے اعتبار سے ایک برجستہ اور ممتاز کتاب ہے۔ لیجئے ہم اس کی تحریر کے ایک مختصر حصے کو بطور نمونہ آپ کے سامنے لاتے ہیں تاکہ اس کے قلم کی جولانیت اور اس کی خلاّقی آپ کے اذہان عالیہ کا رزق بنے' اس حصے کو اس نے خود اپنی کتاب "شہر شہادت خدا حافظ" میں

بھی کوٹ کیا ہے :

"اب صحرا کو سن لیجئے" : یہ وہ تاریخ ہے جو جغرافیہ کی صورت میں مجسم ہوئی ہے' وہ پراسرا ناپیدا کنار فراخی کہ جس نے مایوسی اور خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو پھیلاؤ کے حوالے کر دیا ہے- خشک اور بے آب و آبادی' نہ اس میں پہاڑ کی چوٹی کا غرور ہے' نہ زمزمہ ہے' نہ نہر ہے' نہ چشموں کا عاشقانہ ترانہ ہے- نہ کوئی باغ' نہ پھول' نہ منظر' نہ چراگاہ' نہ راستہ' نہ سفر' نہ منزل' نہ مقصد' نہ کسی دریا کی مستانہ چال' نہ سمندر کا آغوش منظر' نہ کوئی ابر' نہ خندہ رعد و برق اور نہ درد گریہ تند... کچھ بھی تو نہیں!

بالکل ساکت' خاموش' غمگین' مایوس' جھلسا ہوا- دیو' جن' ارواح' خبیثہ اور آدم خور بھیڑیوں کا مسکن' نہاں خانہ خنّاس اور بربادی مچانے والے سیہ کار غاسق' فسونکار نفاثہ اور خیانتکار حاسد کی جولانگاہ..."

اس کتاب کے ساتھ اس کا ایک جوڑ "ہبوط" بھی ہے ہم اس کتاب کو مولانا جلال الدین محمد کا نئے نامہ بھی کہہ سکتے ہیں- اس لئے کہ جس طرح ہم ساری مثنوی کو اس کے شروع کے ۱۸ ابیات کی شرح کہتے ہیں اسی طرح "ہبوط" کی پوری کتاب کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ "ہبوط" کی پوری کتاب شروع کے چند صفحوں کی شرح ہے- یہ خدا کی طرف سے "انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کی داستان ہے- مثنوی اس کے پر سوز نالوں کی شرح ہے جو نیستان ملکوت سے جدا ہو گئی ہے اور اس کی

آہ وزاری نے ہر مرد و زن کو رلا دیا ہے- ہر کسی نے اپنی نگاہ سے خاکستان کے اس آوارہ وجود کو دیکھا ہے یہ جانے بغیر کہ اس دردناک فریاد کی تہ میں کونسا دکھ نہفتہ ہے اور آخر کار وہ ایک زخمی کبوتر کی طرح اپنا سر اپنے شکستہ بازو میں دے کر اسی میں جی سے گزر جاتا ہے-

پورا ہبوط اسی فکر اور اسی خیال سے مالا مال ہے :وہ دکھ جو صرف بڑی ہستیوں کے سینوں میں اترتا ہے' وہ داغ جو پھیلی ہوئی چھاتیوں پر میخوں کی طرح لگا ہوا ہے- یہ دکھ اور یہ داغ ان مضطرب اور تنہا روحوں کی آماجگاہ ہے جو زمین سے اپنا رشتہ توڑ کر اپنے اصل سے ملنا چاہتی ہیں وہاں جانا چاہتی ہیں جہاں سے آئی ہیں- لیکن کوئی اس اضطراب کی صدائے پا کو محسوس نہیں کرتا' کوئی زبان اس کی ہمدردی میں وا نہیں ہوتی- لوگوں نے روزمرہ کی زندگی کے متعفن گنداب (سڑی کیچڑ) میں اس طرح اپنا سر دے رکھا ہے کہ گویا انہیں اس بدبودار تالاب سے سر اٹھانے کا ارادہ ہی نہیں ہے-

"ہبوط" باطنی نقطہ نظر سے انسان کی خلقت کی داستان ہے جو شروع سے اب تک چلی آرہی ہے' اور یہ حرکت ایک طرح کی طویل تاریخی جہاں بینی کی داستان ہے کہ انسان کس طرح زمانے کے فرش پر تکامل پاتا ہے یہاں تک کہ خلیفۃ اللہ ہو جاتا ہے' جہاں بینی کے عمیق ترین مسائل آدمی کی خلقت کی کہانی میں ابھرتے ہیں اور آئیڈیالوجی کی چوکھٹ کی تشکیل کرتے اور اس کی سنگ بنیاد رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ایک خاص

اہمیت کی حامل ہے اس لئے کہ اس نے فلسفۂ تاریخ اور اسلامی جہاں بینی میں داخل ہونے کے اصلی مدخل کو اپنے اندر سمیٹا ہوا ہے۔

آج سوشیالوجی یا عمرانیات میں ڈی پولیٹیسائزیشن (DE-POLITICIZATION) کے نام سے ایک اصل کی شناخت ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عوام الناس کو سیاست سے دور رکھا جائے' لوگ عالمی اور خود اپنی سرنوشت سے متعلق مسائل سے لاتعلق ہوں اور ان میں کوئی حساسیت نہ پائی جائے بلکہ سرے ہی سے انہیں ان باتوں سے دلچسپی نہ ہو اور وہ دوسرے کاموں پر توجہ دیں۔ اس کام کے لئے لوگوں کی شناخت ضروری ہے' یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ کن چیزوں سے ان کی دلچسپی ہے۔ ان کی سوچ کا انداز کیا ہے اور کس دلچسپی اور حساسیت کو ان کے وجود میں اتارا جاسکتا ہے کیونکہ ماہرین طرز ابلاغ کا کہنا ہے کہ کسی دل سے کسی حساسیت یا کسی چاہت کو ختم کرنے کے لئے اس کی جگہ دوسری حساسیت یا چاہت کو لانا ضروری ہے۔ اور یہ بات ۱۹۴۵ء یعنی دوسری جنگ عظیم تک یورپ کی تاریخ میں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ اب کن صورتوں سے ماضی کے معاشروں کو ڈی پولیٹیسائز کیا گیا اور پھر کس طرح اسلام میں عدل اور امامت منسوخ ہوئی اور اس کی جگہ کن چیزوں نے لی اس کا بھید آپ کو "اسلام میں عدل اور امامت کی انقلاب آفرینی" نامی کتاب میں ملے گا' اور آپ دیکھیں گے کہ وہ کس بلندی سے چیزوں کا مطالعہ

کرتا ہے اور کس عقابی نگاہ سے باتوں کی تہہ تک پہنچتا ہے۔

آج ہر شخص وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے قریب تر لانے کی کوششیں کی جائیں اور اب یہ آواز دنیا کے گوشے گوشے سے سننے میں آرہی ہے مگر آج تک اس کے عملی اور منطقی طریقہ کار پر کسی نے قابل فہم یا سو فیصد قابل عمل کوئی بات نہیں کی اور اگر کچھ کہا بھی ہے تو اس کیلئے کوئی مثالی نمونہ پیش نہیں کیا ہے کہ جس کے نقش قدم بھٹکے ہوئے مسافروں کو نشان منزل کا پتہ دیں۔

یہاں گفتگو "قومی وحدت" کی ہے جو فکر و نظر اور عقیدے کی وحدت سے مختلف ہے اور ان ہی دو پہلوؤں پر علی شریعتی نے "علی امین وحدت" کے عنوان سے گفتگو کی ہے اور ان کے فرق کو واضح کر کے اس ہستی کا تذکرہ کیا ہے جس نے "اختلاف" اور "وحدت" کے درمیان ایک تیسری راہ پیدا کی ہے جو اس کی اپنی تھی۔

یہ کتاب ہر اعتبار سے ایک مکمل گفتگو پر مبنی ہے اس کا اختصار توانائیوں کی کائنات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور وہ حقیقت ہے جس سے اب تک دوری اختیار کی گئی ہے۔

-- انسان اپنی قانونی اور قابل تبصرہ زندگی کے آغاز سے آج تک واضح طور پر اپنے عقائد و اعمال اور خیالات و خواہشات میں مثالی نمونوں کا خواستار رہا ہے یہ ایمانی، عملی اور فکری تلاش اس فکری جہت کے

مقابل کہ جہاں تمام کوششیں عام زندگی کو سنوارنے میں صرف ہوتی ہیں ایک بنیادی جہت کی حیثیت رکھتی ہے۔

دیومالائی داستانیں وہ قدیم فکری ذخائر ہیں جس میں انسان کی مطلق پرستی اور مطلوبِ مطلق کے مظاہر کمالات کی پوری جھلک موجود ہے۔ انسان ان داستانوں کے ذریعے اپنی تلخی حیات کو مٹانا چاہتا ہے اور اپنے لئے مثالی نمونے تلاش کرتا ہے' ماقبل تاریخ کے بدوی انسان سے آج کی متمدن یورپی دنیا تک سب دیومالائی صورتیں تراشنے میں مشغول ہیں۔ تاہم آپ "علیؑ ایک دیو مالائی سچ" میں دیکھیں گے کہ ان دیومالائی مظاہر نے انسان کی معنوی حیات میں کیا کردار ادا کیا اور اس داستان میں علیؑ کون ہے اور کیا ہے؟

اس کتاب کی عظمت کے آگے ہر تحریر' ست ہر زبان گنگ اور ہر قد آور پست ہے۔ کاش دنیا ان تحریروں پر توجہ دے اور بنظر غائر مطالعہ کر کے ایسے افکار کو سلام کرے۔

-- مسلم معاشرہ عبارت ہے اس معاشرے سے کہ جہاں مسلمان آباد ہوں خواہ ان کی اقتصادی' اجتماعی' فوجی یا حکومتی شکل کیسی ہی کیوں نہ ہو ہم اسے مسلم معاشرے سے تعبیر کریں گے اور یہ بدھ مت اور عیسائی معاشروں کے مقابل مسلم معاشرہ کہلائے گا' گویا معاشرہ اجتماعات سے عبارت ہے' یعنی بدھ عقائد رکھنے والوں کا اجتماع' عیسائی پیروکاروں کا

اجتماع اور مسلم اجتماع وغیرہ-

لیکن امت اسلامی ایک خاص معاشرے' ایک خاص تعلق' خاص قوانین' خاص اجتماعی گروہ بندی' خاص پہلوؤں اور خاص اشکال پر منطبق ہے کہ جہاں حتماً امت سے امامت پھوٹتی ہے- جب "امت" سامنے آتی ہے تو اس کے لئے "امامت" کا ہونا بھی ضروری ہو جاتا ہے- گویا "امامت" ' "امت" کی اجتماعی' سیاسی' فکری اور کبھی جدا نہ ہونے والی طاقت ہے- اس بناء پر "امامت" دیگر مباحث کے برخلاف اب تک زیر بحث آنے والے یا ہمارے ذہنوں میں موجود تمام مباحث سے بالکل ایک الگ بحث ہے- ارسٹوکریسی' ڈیموکریسی' الیگارشی' منارکی اور ڈکٹیٹری جیسے دیگر نظاموں کے مقابل "امامت" اصولاً ایک الگ طرز زندگی اور ایک الگ قانون کا نام ہے جو ایک خاص فکر کی اساس پر ایک خاص اجتماعی نظام کی حامل ہے اور معاشرے کا مثالی نمونہ ہے' اس پیمانہ فکر اور معیار گفتگو کو آپ "امت اور امامت" نامی کتاب میں انتہائی سلجھی ہوئی گفتگو کے ساتھ مشاہدہ فرمائیں گے-

--انسان اصولی طور پر جب کسی واقعے یا ظہور کا منتظر ہوتا ہے تو گویا وہ ان موجودہ حالات پر راضی نہیں ہوتا جس میں کہ وہ ہے وگرنہ وہ تبدیلی کا منتظر نہیں رہتا- خوشحال کبھی تغیر و تبدیلی کا منتظر نہیں ہوتا' ناخوش انسان ہی تبدیلی کے انتظار میں ہوتا ہے- اس بناء پر موجودہ حالات کے

بارے میں خود اس کا اپنی ذات میں منتظر ہونا' معترض ہونا ہے- یعنی ہم سب مومن و کافر کے اعتقادات کے بر عکس جہاں سے کہا جاتا ہے کہ "انتظار" راہ عمل کو روکتا ہے اور یہ فلسفہ تسلیم و تمکین اور منفی مذہب سے عبارت ہے 'انتظار- مذہب اعتراض ہے- چنانچہ "انتظار' مذہب اعتراض" نامی کتاب میں علی شریعتی نے انتظار اور عقیدۂ انتظار کے فلسفے سے متعلق تمام مسائل کو فقط اور فقط تاریخی' طبقاتی اور معاشرتی تجزیے کی بنیاد پر پیش کیا ہے 'اور بتایا ہے کہ زمانۂ انتظار وہ زمانہ ہے جس میں انسان پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں- دور غیبت دنیا کے لئے شدید ترین ذمہ داریوں کا دور ہے مگر اب وہ نفی مسئولیت کا دور ہو گیا ہے-

-- ہم ابھی تک توتم پرست یا بالفظ دیگر محبوب پرست ہیں- ہر کسی کا ایک "توتم" ہے- ہر کوئی موجودات عالم میں سے کسی نہ کسی سے تعلق خاطر رکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس کا تعلق اس موجود سے پوشیدہ طور پر اتنا گہرا ہے کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا اور وہی اس کا توتم ہے- وہ اپنی شخصیت کو اپنے توتم سے جدا نہیں سمجھتا- اپنے آپ کو اسی میں دیکھتا ہے- اپنی نری سچائی کو اسی میں پاتا ہے- ہر کسی کا توتم "خود" وہ ہے کہ جس نے اس کی ذات سے باہر اپنا وجود بنالیا ہے اور جسمانیت اختیار کی ہے- اب کس کا کیا "توتم" ہے اور اس کی تفصیل کیا ہے یہ وہ باتیں ہیں کہ جنہیں آپ "توتم پرستی" نامی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے اور اس کے طرز بیان

سے لطف اندوز ہوں گے اور دیکھیں گے کہ قلم کس طرح علی شریعتی کا توتم ہے۔

---عمرانیات یا سوشیالوجی کے اعتبار سے بہت سے اعمال و مفاہیم کے معنی، ان کے پیغام اور ان کے کردار، معاشرے کے انقلابات کی درازیٔ وقت اور تاریخ و زمانے کے تغیر کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہ تغیر و تبدیلی "مثبت" سے "منفی" اور انقلابی ترین کردار سے ارتجاعی ترین کردار تک کا ایک فاصلہ ہے۔

سماجی تاریخ و انقلاب اور معاشرتی نظاموں کے درمیان اختلاف بعض اوقات کسی مفہوم اور کسی نئی بات کو اس طرح بدل دیتا ہے کہ "خیر"" "شر" ، "ارتجاعی، انقلابی" اور "انقلابی، ارتجاعی" ہو جاتا ہے اور "منطقی بات" ، "غیر منطقی" اور "غیر منطقی بات" ، "منطقی" دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے حقائق اور اصول مطلق کے علاوہ بہت سے اعمال و افکار و احکام ایسے ہیں جو اپنے وقت کے اعتبار سے صحیح مفہوم کے حامل ہیں مگر جب ان کا وقت گزر جاتا ہے تو ان کی صورت بھی بدل جاتی ہے اور ان کے مفہوم میں بھی فرق آجاتا ہے۔ یہ وہ حکمت بھری باتیں ہیں جنہیں علی شریعتی نے "ذکر اور ذاکرین" نامی کتاب میں لکھا ہے اور ناقابل تردید دلیلوں اور مثالوں کے ساتھ اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ واقعتیوں کو ان کے زمان و مکان کی خصوصیتوں کے ساتھ پرکھنا چاہئے۔ یہ ان ہی کتابوں میں

سے ایک کتاب ہے جسے علی شریعتی کے والد بزرگوار نے "عمدہ" اور "پرکشش" قرار دیا ہے۔

-- ہر کوئی خدا سے گفتگو کر سکتا ہے' اپنی چاہتوں اور اپنی حاجتوں کو اپنی زبان میں اس کے حضور پیش کر سکتا ہے۔ دعا کرنا عشق کرنے' احساس کرنے اور چاہنے سے متعلق ایک تجلی ہے۔اس بناء پر یہ شناخت اور ادراک کے لئے ایک راہ ہے اور ایمان لانے اور ایقان پیدا کرنے کا ایک راستہ ہے۔ "الکسس کارل" کے مطابق "دعا کائنات کے عظیم اور پراسرار روحانی مرکز کی طرف انسان کے روح کی پرواز ہے۔ جن باتوں کو قابلیت سے' کام کاج سے' غور و فکر سے حاصل کیا جانا چاہئے ان میں زورِ دعا کو دخل نہیں۔ دعا' یعنی اپنی چاہتوں اور ضرورتوں کی تکرار' یہ وہ تازیانہ ہے جو انسان کے مقدس آئیڈیلز اور درخواستوں کو تازہ رکھتا ہے تاکہ روح روزانہ کے پست اور گھٹیا عینیت کے درپے نہ ہو۔ دعا صرف اس موجودہ زندگی کی ضرورتوں کا چاہنا نہیں بلکہ بلند پایہ دعا زندگی سے بالاتر ضرورتوں کا چاہنا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں علی شریعتی نے "نیایش" یعنی دعا نامی کتاب میں تحریر کیا ہے۔

علی شریعتی نے سطحی طور پر اسلامی دعاؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان تین عناصر پر گفتگو کی ہے جو اسلامی دعاؤں کی تشکیل کرتے ہیں۔ان میں سے ایک 'زبان کی فصاحت وبلاغت۔دوسرے' جملوں کے الفاظ اور متن میں

کلام کی موسیقیت۔ اور تیسرا' ان کا فکری عنصر ہے۔ وہ اس کتاب میں "صحیفہ سجادیہ" کو پیش کر کے کہتا ہے کہ اس میں ساری اسلامی دعاؤں کا متن شروع سے آخر تک خدا شناسی' انسان شناسی' اخلاقی اصول' معاشرتی اصول' لوگوں کے ایک دوسرے پر حقوق' بشری آئیڈیلز کی گفتگو' اور اسی طرح سماجی' انفرادی اور اخلاقی پستیوں اور خطروں سے خوف و گریز کی گفتگو پر مشتمل ہے۔

اور پھر بتایا کہ : "صحیفہ سجادیہ" تنہائی میں جہاد' چھائی ہوئی خاموشی میں ابلاغ اور عرض مدعا کی کتاب ہے' شکست میں مورچہ سنبھالنا ہے' گھٹن میں فریاد کی آواز بلند کرنا ہے' سلے ہوئے ہونٹوں سے سبق دینا ہے' غیر مسلح کئے جانے والے کا اسلحہ سنبھالنا ہے۔ اور ان سب باتوں کے باوجود دعا کی کتاب ہے۔

"اگر ہر دین کو اس ذمہ داری کی نظر سے جانچا جائے جو انسان کی نجات کے لئے اس کے ذمہ ہے تو ہمیں اجتماعی ترقی' خود آگاہی' ارتقاء' فرض شناسی' انسانی خواہشات کی تکمیل' اجتماعی طرز فکر' روح عدالت خواہی اور عزت طلبی' اور پھر مادی قوت کے ساتھ حالات کی بہتری' طبیعت نگری' حقیقت پسندی' علمی پیش رفت' تعمیر و ترقی' امور مدنیت' فکری کاوش اور عمومی رجحانات کی مرکزیت میں کوئی مکتب' مکتب اسلام سے زیادہ بلند' زیادہ بیدار اور زیادہ مستحکم نہیں ملتا کہ جو رسالت محمدؐ میں ابراہیمی توحید کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے کوئی ایسا دین نظر

نہیں آتا کہ جو اسلام سے زیادہ انحطاط کا شکار ہو اور اس نے "جو کچھ تھا" اور "جو کچھ اب ہے" کے درمیان فاصلے کو حد تناقض تک طے کیا ہو-!"

یہ گفتگو ہے جسے علی شریعتی نے اپنی "حج" یا (خدا ایک کنیز کے گھر میں) نامی کتاب میں چھیڑا ہے اور حج کی منزل پر آکر کہا ہے :

"اگر تم عمل حج کو جاننا چاہتے ہو تو مناسک حج سے متعلق فقہا کی کتابیں پڑھو اور اگر حج کے مفہوم کو سمجھنا چاہتے تو اسلام کو سمجھو اور اس میں انسان کو پہچانو- اور اگر تم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ میں نے حج کو کس طرح سمجھا ہے تو میری یہ تحریر پڑھو' شاید یہ تمہیں حج کو سمجھنے پر تھوڑا سا ابھارے-- تھوڑا سا !"

حج کے تمام اعمال اشاریے ہیں- ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور ان ہی باتوں کو علی شریعتی نے اس کتاب میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے : حج' حج معانی ہو' حج مناسک نہیں- یہ کوئی فقہی رسالہ نہیں کہ لوگ اس کے مطابق حج کے رسوم کو ادا کریں بلکہ یہ ایک فکری رسالہ ہے اور اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مناسک حج کی تفسیر ہو وہ بھی ایک عام آدمی کی حیثیت سے' عالم دین اور اسلامی مرجع کی حیثیت سے نہیں-

اس کو پڑھ کر حج ایک جوش مارتا زمزم بن جاتا ہے اور حاجی ایک ایسے نور کا حامل ہوتا ہے کہ جو آخر عمر تک اس کے تاریک ماحول میں روشنی بکھیرتا ہے- ایک ابدی زندہ رہنے والی اکائی' ایک لامتناہی

حرکت بن جاتی ہے- ذہاب مطلق ہوجاتی ہے' انسان دار عمل سے دار حساب کی طرف رحلت کرتا ہے' لاشئے سے شئے بن سکتا ہے-

-- انسان کی قدرو قیمت کا اندازہ اس کی گفتگو سے ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص کی گفتگو اس کی ذہنی اور اخلاقی حالت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور جب ہم ڈاکٹر علی شریعتی کو اس پس منظر میں دیکھتے ہیں اور ان کے خیالات و جذبات کا اندازہ لگاتے ہیں تو تحریک انقلاب کے اس بانی کی قدرو منزلت ہماری سمجھ میں آتی ہے-

اس کے لب و لہجہ نے تمام نوجوان نسل کو اپنے کلام کے اختیار قدرت میں لے لیا تھا اور ہر فرد دیوانگی کی حد تک اس کا عاشق تھا- اس نے اسلام کو ایک نئے زاویئے سے متعارف کروایا- "سورۃ روم" کی تفسیر سے متعلق کتابچہ میں آپ دیکھیں گے کہ اس نے اس کی شرح کس انقلاب آفریں انداز میں کی ہے اور مسلمانوں کی نجات' ان کی آزادی اور بیداری کے لئے کیا رخ اختیار کیا ہے اور کس جذبے سے گفتگو کی ہے- اس نے بتایا ہے کہ : سورۃ روم اس حقیقت کے اثبات کی عکاس ہے کہ قرآن ایک زندہ کتاب ہے جبکہ زمانے کی ہر شئے متغیر ہے- ستم کار مجرم پیشہ' بڑی طاقتوں' خلفاء' ملوک' بد نہاد علماء اور اندرونی اور بیرونی بد خواہ دشمنوں نے کہ جن کا بنیادی خوف قرآن سے رہا ہے خوش قسمتی سے سب کچھ کیا مگر وہ نہ قرآن کو مٹا سکے اور نہ اس کی نفی کر سکے فقط کوشش کی کہ اس کی تفہیم غلط

ہو- کوشش کی کہ قرآن کو ہماری فکر' ہمارے مطالعے' ہماری راہ' ہماری صحیح سوچ اور ہماری مذہبی تعلیم سے دور رکھیں- کوشش کی کہ قرآن صرف خوبصورت جلد' خوبصورت طباعت اور تنہا قرأت پر منحصر رہے- لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ پورے عالم اسلام میں' ہر کوئی وہ بوڑھا ہو کہ جوان' تعلیم یافتہ ہو کہ غیر تعلیم یافتہ' شیعہ ہو کہ غیر شیعہ' مشرقی ہو کہ مغربی' وہ جس فرقے کا ہو' جس نسل کا ہو' جس ثقافت کا ہو' اس بات کا معتقد ہے کہ "اسلام کا بنیادی پتھر قرآن ہے"- یہ ایک ایسا کلام ہے جو تمام تبدیلیوں اور تمام انقلابوں میں ثابت رہتا ہے' اور پھر عملی اثر بھی اپنے اندر رکھتا ہے-ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو بھی واضح کیا کہ یہ کتاب بیدار مغز انسان کو ہر مرحلہ میں' وہ خواہ سیاسی ہو کہ سماجی' تہذیبی ہو کہ طبقاتی' راستہ دکھا کر نجات سے ہمکنار کرتی ہے-

گو کہ اس میں مکمل طور پر پوری آیتوں کی تفسیر نہیں ہوئی ہے مگر اس کے اصل مقصد کو ان آیتوں کی تفسیر میں پیش کیا گیا ہے کہ جن کا تعلق پیغام سے ہے اور جو ملت اسلامیہ کی بیداری کے لئے ضروری ہے-

---یہ ایک کھلی بات ہے کہ آج ہم اپنے زمانے کے اختتام کی سرحد پر پہنچ گئے ہیں اور اب ہمارے سامنے نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے-اس دور کا کہ جس میں مغربی تمدن اور کمیونسٹ آئیڈیالوجی دونوں انسان کی نجات سے عاجز ہو گئے ہیں اور انہوں نے اس کی سرنوشت کو صدمہ پہنچایا ہے اور نئی

نسل ان دونوں سے پھر گئی ہے اور اب انسان کی فلاح کی جستجو میں ایک دوسرے راستے اور دوسری جہت کو تجربے کی منزل پر لانے کے دور کا آغاز ہورہاہے کہ جس میں انسان اپنے گوہرِ وجودی کو نجات دے اور اس سقف طبیعت پر کہ جس نے اپنی روح اور اپنی روشنی کھودی ہے اس تابناک قدوسی فانوس کو آویزاں کرے کہ جس کی روشنی میں' اپنے آپ سے بیگانہ شخص اپنی فطرت کو دیکھنے لگے' اپنے آپ کو پائے اور فلاح کے راستے کو کھلا دیکھے۔

علی شریعتی "انسان' مارکسیزم' اسلام" میں اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اس نئی حیات و حرکت میں' اسلام ایک بلند مقام کا حامل ہے۔اس لئے کہ اسلام اپنی "خالص اور بے عیب توحید" کے ساتھ دنیا سے متعلق اس عمیق "معنوی تفسیر" کو بھی پیش کرتا ہے جو اتنی ہی اشراقی اور امنگوں بھری ہے جتنی کہ عقلی اور منطقی اور نیز "خلقت آدم" کے فلسفے کے ساتھ ہیومینیزم سے متعلق اُس مستقل' آزاد اور بلند پایہ جوہر کی نشاندہی بھی کرتا ہے جو اتنا ہی الٰہی اور آئیڈیل ہے جتنا کہ وہ 'اس دنیا کی عینیت اور زمینی واقعیت میں ہے۔

-- ایک روشن خیال آدمی کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے آپ کو پہچانے جب تک اسے اپنا عرفان حاصل نہیں ہوتا اس وقت تک معاشرے کی پہچان اس کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔اس کے لئے یہ جاننا

ضروری ہوتا ہے کہ اس میں کونسی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور یہ کہ وہ کس تاریخ اور سماجی صورتحال میں نمودر ہوا ہے اور اس میں پائی جانے والی خصوصیات کی جڑ کہاں ہے۔ اپنے اس تجزیے کے بعد ہی وہ معاشرے کو سمجھ سکتا ہے اور اسے اس راہ پر چلا سکتا ہے جس پر چلنا اور چلانا اس کی ذمہ داری ہے میں شامل ہے۔

ہم جو اس وقت پچھلی نصف صدی سے روشن خیال نامی ایک تہ یا طبقے کے دار اہیں اس بات پر از خود مجبور ہیں کہ ہر چیز سے پہلے اس طبقے کا تجزیہ کریں۔ اگر ہم خود اس کا حصہ ہیں تو خود اپنا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ ہماری آمد کہاں ہوئی ہے؟ ہم کب اور کیوں آئے ہیں' اور کس طرح یہ طبقہ وجود میں آیا ہے۔

علی شریعتی نے "روشن فکر و مسئولیت او درجامعہ" (روشن خیال اور معاشرے میں اس کی ذمہ داری) کے عنوان سے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کر کے اصلی اور نقلی روشن خیال آدمی' مفاہیم کی برگشتگی یا ان کے بگاڑ۔ انٹلکچول طبقے کی تشکیل۔ طبقے کا وجود کب عمل آتا ہے۔ سترھویں صدی کے روشن خیال آدمی کی خصوصیات۔ سماجی حقائق کی نسبیت۔ حرف کی جغرافیہ۔ روشن خیال طبقے کی علم پرستی۔ سترھویں' اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے روشن خیال لوگوں کی خصوصیات۔ انحرافی علم پرستی۔ اصل اور مقلد روشن خیال آدمی۔ ایک پرجوش تمدن کے ابھرنے کی زمین۔

مشرق اور اسلامی معاشروں میں روشن خیال لوگوں کی پیدائش اور آخر میں ہمارے روشن خیال افراد پر روشنی ڈالی ہے۔

-- آج ہم مغرب کے سامنے کھڑے ہیں اور ہماری مادی، معنوی، فنی، ادبی بلکہ اخلاقی زندگی کے فکری دھارے ہر لمحے اور ہر دقیقے وہیں سے ہماری سمت آرہے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم مغرب کو اس مفہوم میں سمجھیں کہ وہ کس طرح ان مراحل کو طے کر کے یہاں تک پہنچی ہے؟ اس سوال کا دقیق، علمی اور صحیح تجزیہ، روشن خیال حضرات کو اس راہ میں مدد دے گا کہ وہ مغرب کی ترقی کے اسباب کو سمجھیں اور اس کے بارے میں درست، منطقی اور آگاہانہ فیصلہ کریں۔ اور یہ وہ آگاہی ہے کہ جو ہمارے انسانی کردار اور ذمہ داری کو بروئے کار لانے کے لئے راستہ فراہم کرتی ہے۔

اس کام کے لئے علی شریعتی نے "مخروط جامعہ شناسی" (مخروط ثقافتی سماجیات) نامی کتاب میں ایک مخروط سے استفادہ کیا ہے جس میں اس نے ایک طرف منفی سوچ رکھنے والے انتہا پسندوں، دوسری طرف مثبت سوچ رکھنے والے انتہا پسندوں اور تیسری طرف انٹلکچولز کو رکھا ہے اور بڑے موثر انداز میں بات کو نتیجہ تک پہنچایا ہے۔

-- آدمی ایک خاص عنصر ہے۔ وہ معجزہ ہے جو پتھر سے ابھرتا ہے۔ وہ درخت ہے جو زیادہ تر صحرا میں اگتا ہے۔ کارخانوں، آبادیوں، اور وہاں جہاں آدمی بنانے کے وسائل موجود ہیں بہت کم آدمی وجود میں آتے ہیں۔

ہمیشہ ایسے مقامات سے جہاں سے کسی کو کسی روح کی بعثت اور کسی استعداد اور فطانت کی توقع نہیں ہوتی کوئی باہر نکلتا ہے اور تاریخ کا رخ موڑ دیتا ہے۔ ایسے لوگ صحراؤں سے ' انسانی زندگی کی غربت سے ' ایسے مقامات سے جہاں سے فطرت نے ان پر رحم نہیں کھایا' جہاں مدرسے ' یونیورسٹی ' علم ' تکنیک اور تاریخی پس منظر کچھ بھی نہیں تھا اچانک باہر آئے اور انہوں نے پوری تمدن اور پوری ثقافت کو بدل دیا۔

آج تیسری دنیا کے لوگ نئی تمدن کے سامنے کھڑے ہیں اور آج کے مفہوم میں متمدن ہونا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے دو راستے اختیار کر رکھے ہیں ایک ' دوسروں پر تکیہ اور دوسرا خود انحصاری۔ لیکن "راہ سوم" (تیسری راہ) نامی کتاب میں علی شریعتی ایک تیسری اور اصلی راہ کی ہمیں شناخت کراتے ہیں اور وہ ہے آگاہی اور صرف آگاہی ' ایک اپنی سماجی صورت حال کی نسبت آگاہی اور دوسری خود اپنی نسبت آگاہی ' کہ یہی ' مخلوق انسان کو خالق بناتی ہے اور اسیر قوموں کو آزادی سے ہمکنار کرتی ہے۔

جب کوئی شخص وسیع علمی اطلاعات کا حامل ہوتا ہے اور اعلی تعلیمات حاصل کر کے بڑے بڑے اساتذہ اور بڑی بڑی کتابوں کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ فکری نقطہ نظر سے وہ ایک آگاہ انسان کے درجے پر فائز ہے اور یہ ایک فریب کاذب ہے علمی پیاس کی دوری کے ساتھ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے

کہ فکری نقطۂ نظر سے بھی ہم اشباع یافتہ یا مطمئن ہیں- انسان کتنی ہی بڑی ڈگریاں لے مگر شعور، فہم، آگاہی، تاریخی حرکت کی تشخیص اور اپنے زمانے کے آگے ذمہ داری کے احساس سے عاری ہو تو اس سے بڑا خطرہ اور کیا ہو سکتا ہے ہم کسی طرح بھی خود آگاہی اور سماجی آگاہی کو نظر انداز نہیں کر سکتے-

بنی عباس کے دور میں علم منزل کمال پر تھا لیکن لوگوں میں اپنی سرنوشت کے بارے میں حساسیت نہیں تھی اور اس کا نتیجہ ہم نے دیکھا کہ جب مغل آئے تو نہ تو تمدن رہی، نہ قوت رہی اور نہ آگاہی رہی- ساری شان و شوکت، ساری عظمتیں، سارا تمدن اور مشرق و مغرب میں ساری اسلامی شہنشاہیت، قربانی کے جانور کی طرح مغلوں کی تلوار اور تازیانوں کے آگے رام تھی اس لئے کہ سماجی خود آگاہی موت کی نیند سو گئی تھی علی شریعتی ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر اپنی "خود آگاہی واستعمار" نامی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ بنی عباس کے زمانے میں عامل استحمار- علم، تمدن، تحقیق، اور آرٹ وادبیات ہیں- اور اسی ضمن میں وہ استحمار کے مفہوم کو بھی واضح کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ حمار سے نکلا ہے جس کے معنی گدھے کے ہیں لہٰذا استحمار لوگوں کو بیوقوف بنانا ہے- اس کے بعد وہ اس کی دو قسموں پر بھی گفتگو کرتے ہیں اور اس کے لئے بڑی شگفتہ مثالیں پیش کرتے ہیں-

-- جب ہم دنیا میں سماجی انقلابات کی تاریخ کی ورق گردانی کرتے

ہیں تو اُس خاص دور میں پہنچتے ہیں کہ جس میں "نقطہ آغاز کہاں سے ہو؟" یا "ہمیں کیا کرنا چاہئے" نام کے بہت سے آثار ملتے ہیں-ان میں سے بیشتر آثار وہ ہیں جو سماجی انقلابات سے متعلق خاص حالات میں طباعت کے عمل سے گزرے ہیں-یعنی قرون وسطیٰ میں کسی مصنف نے ہرگز کوئی کتاب ان عنادین کے تحت نہیں لکھی' اس بناء پر یہ ایک اسٹرٹیجیکی بحث ہے' آئیڈیالوجیکی نہیں- سماجی انقلاب خود آگاہی کے بغیر عمل میں نہیں آتا- "افلاس کا وجود" حرکت پیدا نہیں کرتا' "افلاس کا احساس" لوگوں کو حرکت میں لاتا ہے اور اس احساس کو روشن خیال آدمی لوگوں کے دلوں میں جگاتا ہے-

اس وقت ہمارے قومی سرمایوں پر دوسرے لوگ مسلط ہیں اور ہمارے پاس کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے-پس ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ یہ سب وہ باتیں ہیں جنہیں علی شریعتی نے "از کجا آغاز کینم" (نقطہ آغاز کہاں سے ہو) نامی کتاب میں قلمبند کیا ہے-

-- تاریخ کے تجربے نے یہ بات بتائی ہے کہ مذہب' وہ طاقتور ترین عامل ہے جو انسانی معاشروں کو تشخص' اعتماد' اپنی نسبت ایمان اور اغیار کے مقابل استقلال بخشتا ہے- اور استعمار' دنیا پر اپنی یلغار میں اس کو قوموں کے درمیان اپنے معنوی اور سیاسی نفوذ میں سب سے بڑی رکاوٹ محسوس کرتا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قوموں کے درمیان

تاریخ، ثقافت اور روایت کی تکوین، روح مذہب بلکہ بعض جگہ مذہب سے ہوئی ہے۔ چنانچہ مغربی استعمار نے سب سے پہلے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مذہب 'انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور پھر اپنی کوششوں سے ایک ایسی نسل پیدا کی جو فرنگیوں کی ہم شبیہ بنی اور اس نے اپنے آپ کو رام بن کر، بن مول اُس سر نوشت کے حوالے کیا جو اس کے لئے بنائی گئی تھی اور اس نے بڑے ولولے اور ذوق و شوق سے اپنے دروازے دشمن پر کھول دیئے اور اس "تمدن کی بربریت!"، "تکنیک کی جلادی، علم کی حیلہ گری، فن کی جادوگری" فلسفے کی دغلکاری اور ڈیموکریسی اور بشر دوستی کے نفاق کے دور میں اچانک نہتے ہو گئے۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر علی شریعتی نے اپنی "چہ باید کرد" نامی کتاب میں اس کا حل لکھا ہے اور اھداف میں دس باتیں ہمارے سامنے رکھی ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی باتیں آپ کو "استخراج و تصفیہ منابع فرھنگی"۔ "رابطہ روشن فکر در جامعہ" اور اس کی بعض دوسری کتابوں میں ملیں گی۔

انسان کبھی دنیا کو اس طرح نہیں دیکھتا جس طرح جغرافیہ بتاتی ہے۔ ہر کسی کی جہاں بینی اس کے معاشرے کے معنوی اور مادی مشخص ابعاد کی تابع ہوتی ہے اور شہروں کی ترقی و تعمیر کے ساتھ ساتھ وہاں رہنے والوں کی نظر میں بیرونی دنیا کی صورت بھی بدل جاتی ہے اور اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ گویا ہر کوئی اپنی جہاں بینی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ پس

جہاں بینیوں کا جائزہ در حقیقت انسانوں کا جائزہ ہے- اس بات کو مد نظر رکھ کر جب ہم ادبیات میں جاتے ہیں، حتیٰ ان ضرب الامثال کا تجزیہ کرتے ہیں جو ہمارے زبان میں مستعمل ہیں تو ہم جہاں بینی کو ان اشعار، ان ادبی آثار یا ان ضرب الامثالوں میں مشاہدہ کرتے ہیں- چنانچہ حافظ اور مولانا روم کی جہاں بینی کا فرق ملاحظہ فرمایئے- حافظ کہتے ہیں : "جہاں وھرچہ در آن است ھیچ در ھیچ است" یعنی دنیا اور اس میں موجود ہر شئے بیکار ہے، ھیچ ہے، کچھ نہیں ہے- مگر مولانا روم کہتے ہیں : "اگر یک ذرہ را برگیری از جائی + فرو ریزد ہمہ عالم سراپای-" یعنی دنیا ایک دقیق نظم اور حسن انتظام کے ساتھ ایک خاص مقصد اور خاص ہدف کے لئے بنی ہے اور اگر اس کے ایک ذرّے کو بھی اپنی جگہ سے ہٹادیا جائے تو یہ پوری کائنات ڈھ جائے گی-

"جہاں بینی و آئیڈیالوجی" نامی کتاب میں ڈاکٹر علی شریعتی نے ان ہی باتوں کو انتہائی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے، اور جہاں بینی کی اقسام پر گفتگو کی ہے اور اس میں توحیدی جہاں بینی کے عمل کو اعلی سطح پر اجاگر کیا ہے-

ڈاکٹر علی شریعتی کی ہر کتاب پر گفتگو خود ایک ضخیم کتاب کو معرض وجود میں لائے گی اور آج کے محترم قارئین وقت کی تنگی کے سبب اس کے پڑھنے سے قدرے گریز کریں گے اور پھر عام لوگوں کی استطاعت کو بھی نظر میں رکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ ان ہی ذکر شدہ کتابوں کا مطالعہ ہی علی شریعتی کی پوری فکر، پوری توجہ، پوری کوشش اور پورے ہدف کو اس

کے ساحرانہ انداز اور فسوں ساز زمین میں سطح فکر پر لاسکتے ہیں۔ یہ تو ہم نے بہت لکھ دیا وگرنہ ہمارا میتھڈ درست ہو تو اس کے بغیر بھی کتاب کے حساس نکات کو دریافت کرنا کچھ مشکل کام نہیں :

"ہر کتاب کو کھولنے کے ساتھ ہی وہ خواہ کسی شاعر کا دیوان ہو یا فلسفہ کی کوئی کتاب یا کوئی ادبی رسالہ ' سب سے پہلے جو چیز دیکھنے میں آتی ہے وہ کتاب کا نام اور اس کے عناوین ہیں۔ مثلاً شعری مجموعے میں کتاب کے نام' اس کے ابواب اور شعر پر تھوڑی سی توجہ سے ہم شاعر اور کتاب کے بارے میں ابتدائی نظریہ قائم کر سکتے ہیں۔ اگر شاعر اپنے اشعار کے لئے مثلاً ان الفاظ اور ان عناوین کو منتخب کرتا ہے : "گستاخ" ' "قربانی" ' "آزادی" ' "زنجیر" ' "لہو" ' "اسیر" ' "اعتراض" ' "عصیان" اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر شدید سیاسی اور سماجی رجحان کا حامل ہے۔ اور اگر "حجر" "وصل" "تیرے نین" "کاسۂ چشم" "گیسو" "دل" "وہ" "آہ" "اوہ" اور اس طرح کے الفاظ کو عنوان بناتا ہے تو ہماری پیشگی رائے یہ ہو گی کہ یہ ایک رومانی' عاطفی اور غزل گو شاعر ہے۔ پس کسی شاعر یا لکھنے والے اور اس کی تخلیق کی شناخت میں پہلا قدم اس کے انتخاب کردہ ناموں اور عناوین کا سرسری مطالعہ ہے۔" (امت و امامت)

اب اگر یہ کتاب ہمارے ذوق پر پوری اترتی ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس کا مطالعہ کریں اور اسے فہم و تجزیئے کے عمل سے گزاریں۔ "لیکن جس چیز

میں شک نہیں وہ یہ بنیادی بات ہے کہ "نام کا انتخاب (حتیٰ ان لوگوں کے لئے بھی جو اپنے بچوں کا نام منتخب کرتے ہیں) انتخاب کرنے والے کے فکری رجحان' اس کے مذاق اور اس کی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔"

چناچہ ہم نے طے کیا ہے کہ ڈاکٹر علی شریعتی کی کتابوں کو ناموں کی حد تک منظر عام پر لائیں اور انہیں اپنی گفتگو کے آخر میں اہل فہم وادراک کے حضور بشکل فہرست پیش کریں۔ بہر حال علی شریعتی کے اصیل' عمیق اور بار آور افکار ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ وہ کسی طرح کے ہلکے اور سطحی کام کا معتقد نہیں تھا' اور اس کے باوجود انتہائی گہرے فلسفی افکار اور پیچیدہ ترین علمی اور سماجی مباحث اس کے طاقتور قلم اور موثر بیان تلے' بد خواہ وبد نیت گروہ کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر' بہت واضح اور قابل فہم تھے۔ تاہم اس کی بعض تحریریں بعض لوگوں کی نظر میں سہل ممتنع (سننے میں آسان' کہنے میں مشکل) دکھائی دیتی ہیں۔ شریعتی اپنی گفتگو میں جن شبہات واستعارات اور مفہوم بھرے سمبولک بیان سے کام لیتا تھا وہ بعض سطحی سوچ کے عادی لوگوں کے لئے ابہام پیدا کرتا تھا اور ان لوگوں کو چون و چرا اور اعتراض کا موقع فراہم کرتا تھا جن کی سوچ کا بس ایک رخ معین ہوتا ہے یا پھر "بہانہ بازی" ' "بحثا بحثی' اور "روڑے اٹکانا" خاص طور پر ایک دہماکہ خیز اور تحقیقی فکر کے عمل میں ان کی ہمیشہ کی عادت ہوتی ہے۔ اس کی گفتگو اور اس کے نظریات باوجود اس کے کہ دینی جہت کے حامل ہیں مگر

یہ فلسفی تاریخی اور سماجیاتی تجزیئے اور شناخت کی بنیاد پر استوار ہیں اور وہ انہیں ہمیشہ جدلیاتی عمل و نظر میں لے جاتا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نظر میں، صحیح فکر، شناخت پر اور صحیح معرفت ایمان پر مقدم ہے اور یہ تینوں چیزیں ایک آگاہ وجدان، ایک فکری اور عملی حرکت اور کمال کی سمت پرواز ہیں۔ سطحی عقیدہ اور آگاہی کے بغیر ایمان، بہت جلد خرافات اور تعصب کو جنم دیتا ہے اور سماجی تعمیری عمل میں رکاوٹ بنتا ہے۔ کسی فکری انقلاب کے بغیر گہری سطح پر، سماجی تبدیلی ممکن نہیں جبکہ اس آگے کی طرف پیش قدم دنیا میں ہماری موجودہ حالت کو ہر چیز سے پہلے ایک عمیق فکری تغیر کی ضرورت ہے۔ اس حرکت اور فکری تبدیلی کو افراد کی فطرت اور ان کے وجدان سے پھوٹنا اور ایک عمومی تحریک کی صورت اختیار کرنا چاہئے اس طرح کہ وہ ان جامد اور بے حس و حرکت تنظیموں کو، جو حقیقت میں صاحبِ قوت ہیں لیکن اب بے اثر اور بے خاصیت ہو گئی ہیں اور ان کی خاصیت صرف یہ رہ گئی ہے کہ وہ "مقدس و محترم" ہیں ان فعال اور متحرک عناصر میں بدل دیں جن کا علت وجودی، اس موجودہ کیفیت اور اس عمومی مومنٹ میں روشن و تابناک ہو۔

حقیقت اسلام کی شناخت، فلسفۂ تاریخ کے اس پرتو میں جس کا سرا توحید سے ملتا ہے اور "شرک کی اس تمدنی زندگی" میں جو "سماجی واقعیتوں" کو بعینہ بیان کرتا ہے امکان پذیر ہے۔ "حسین وارث آدم" میں علی شریعتی

کا تاریخی اور سمبولیک تجزیہ واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام' ایک انسانی آئیڈیالوجی کے سانچے میں کسی معین زمان و مکان سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ حیات بشر کی طول تاریخ میں اس نہر کی طرح ہے جو کوسوں دور رفیع وبلند منابع سے پھوٹ کر پتھریلے راستوں کو طے کر رہا ہے تاکہ سمندر سے جاکر مل جائے- یہ وہ حرکت ہے جو کبھی متوقف نہیں ہوئی ہے اور معینہ وقتوں میں پیغمبروں اور ولیوں نے اسے طاقت اور حرکت دی ہے : پوری تاریخ' حق وباطل' موحد و شرک' ظالم و مظلوم اور محکوم و جارح کی جنگ ہے- اس تنازع اور ٹکراؤ کی ایک صورت "ہابیل و قابیل" کے سمبولیک داستان میں متجسم ہوئی ہے- اس ٹکراؤ کے بیان کی ایک سادہ تر صورت' فرعون و قارون و بلعم کے خلاف کہ جو تاریخ میں زر' زور اور تزویر کے سلمبز ہیں اور ساتھ ہی غالی اور مشرک بھی' جناب موسیٰ کی طرح پیغمبروں کی جنگ ہے-

"ملاء و مترفین" (صاحبان زر و زور) نے ہمیشہ استثماری طبقہ کو جنم دیا ہے جن کے مقابلے پر پیغمبروں کا سلسلہ آتا رہا ہے اور محرموں' مستضعفوں اور صالح لوگوں نے ان پیغمبروں اور شہداء کا ساتھ دیا ہے- یہی وجہ ہے کہ اعتقادی توحید' موحد افراد کی سماجی- تاریخی ذمہ داریوں سے جدا نہیں ہوتا اور توحیدی معاشرہ ایک مجاہد معاشرہ ہوتا ہے- اس سلسلے اور اس حرکت کا آغاز انسانوں (آدم) کی سماجی تاریخ کی صبح سے ہوتا ہے- اور

اس کے علمبردار صلحاء اور پیغمبر حضرات رہے ہیں-اس صورت سے نوع بشر کی سماجی حرکت، توحیدی جہاں بینی سے متصل اور ہم آہنگ ہوتی ہے-

یہ توحیدی "بار امانت" تاریخ بشر میں جناب ختمی مرتبتؐ کے بعد امامت کے ذمہ آتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح علوی تشیع اس تاریخی سلسلے کے "ظاہری جانشینوں" اور شرک و نا انصافیوں کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور کس طرح اس "فارمل" ، "قانونی" اور روایتی خلافت کی نفی کرتا ہے تاکہ اپنی "شہادت" سے اس توحیدی اور خدائی سلسلے کو خلاف واقع تاریخ کے آفت زدہ بالیں سے ہٹا کر اس راستے کی طرف ہدایت کرے جو حقیقت یعنی سچے اسلام کا راستہ ہے-اس صورت سے علوی تشیع، توحید دشمن سلسلے کے خلاف ایک اعتراض کے طور پر قلب امت سے ابھرتا ہے تاکہ ناروا ترجیحات اور ناانصافیوں کو جو ایک "واقعیت" ہے یگانہ حقیقت کی جگہ قرار دے-اس اعتراض کے علمبردار علیؑ اور ان کے فرزند ہیں اور ہم توحید کے حقیقی چہرے کو علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے اعلی صفات فرزندوں اور دوستوں میں دیکھتے ہیں- مگر اب تشیع جو علیؑ، حسینؑ اور جناب زینبؑ کے اعتراض سے عبارت ہے ایک بار پھر زر وزور کے کارگزاروں کے ہاتھ پڑ گیا ہے (تشیع صفوی) اور بعد کے ادوار میں اس کا حقیقی چہرہ برخلاف "ہدایت" ، "مصلحت اندیشی" ، "موقع پرستی" ، "نامناسب تقیہ" اور غیر معتبر توجیحات" کی دھول میں چھپ جائے گا اور

پھر حقیقت فراموش ہو جائے گی... اور ظاہر رحمٰن اور باطن شیطان کے روپ میں توحید دشمنی، علوی تشیع-- یعنی حقیقی اسلام-- کی جگہ لے لیگی- اور ہم ایک بار پھر پچھلی روزمرہ عادتوں کو خود پکڑیں گے- ان باتوں کو سمجھنے کے لئے ہم: "حسینؑ وارث آدم"، "علیؑ، مکتب وحدت عدالت"، "انتظار، مذہب اعتراض"، "امت و امامت"، "تشیع علوی و تشیع صفوی"، "ابوذر غفاری"، "سلمان پاک"، "شہادت"، "شیعہ ہونے کی ذمہ داری" اور "ہاں دوست ایسا ہی تھا" سے رجوع کر کے حق و حقیقت اور سچے اسلام کے دفاع میں اس کی گونجدار آواز کو گوش ہوش سے سن سکتے ہیں... یہ وہ کتابیں ہیں جو ہر روشن خیال اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان کو تشیع، توحیدی تاریخی فلسفے اور اسلام کے انسانی، سماجی آئیڈیالوجی کی حقیقت سے روشناس کراتے ہیں... یہ اس کے تاریخی اور دینی تجزیوں کی، ایک، فکری جہت ہے اور اس کی دوسری جہت، شرک کے اشتراکی عمل اور موجودہ معاشروں کی شناخت اور ان کا حقیقت پر مبنی تجزیہ ہے- یہ وہ منزل ہے کہ جہاں اس کے محاصل، گروہوں کے کردار اور سماجی طبقے، خاص طور پر روشن خیال افراد، آئیڈیالوجیز، موجودہ مکاتب فکر اور تمدن و ثقافت، توحیدی عقیدے سے صرف نظر، زیر بحث آئے ہیں- منتہائے کلام یہ کہ عصر حاضر کا انسان، منہائے توحید، "اپنے آپ سے بیگانہ" ہے اور وجدان سے خالی علم ایک

طرح کی اسکولیسٹک (Scholastic) ہے جس میں ہم شبیہ لوگ حقیقی روشن خیال لوگوں کی جگہ بیٹھ گئے ہیں-اس کے لئے آپ علی شریعتی کی ان کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں: "جدید اسکولیسٹک" ، "تمدن و تجدد" "انسانِ بی خود - جامعہ شناسی شرک" (کھویا ہوا انسان - شرک کی تمدنی زندگی)، "روشن خیال و مسئولیت او" (روشن خیال شخص اور اس کی ذمہ داری)، "اگزیستانسیالیسم و فلسفہ پوچی" (اگزسٹینسیلزم اور مہمل فلسفہ) وغیرہ-

خالصاً سوشیالوجی کے نقطہ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی شریعتی کے دور میں بہت کم ایرانی محقق رہے ہیں جنہوں نے اس دور کے اسلامی معاشرے کی واقعیتوں کو اس جیسی توانائی اور حقیقت بینی کے ساتھ تجزیہ کیا ہو-جو بات اس کی نظر میں اہم تھی وہ مجرد اور مٹے ہوئے مفاہم نہیں، بلکہ اسلامی معاشرے پر حاکم کے چھائے ہوئے موہوم و مطلوب فکری اور اعتقادی ڈھانچے پر مبنی موجودہ حقائق تھے-

اس طرح کے مطالعے اور اس طرح کی شناخت کے لئے وہ اپنے معاشرے کے سماجی حقائق، اور ثقافتی اصطلاحات اور مکاتب سے روشن خیال لوگوں کی آشنائی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ اکثر جگہوں پر وہ انہیں گمراہ کنندہ اور غیر حقیقت پسندانہ گردانتا ہے- حقیقت بھی یہی ہے کہ موجودہ واقعیتوں کا تجزیہ، صرف ہماری ان اصلاحات، تعبیرات، اور مفاہیم کے توسل سے امکان پذیر ہے جس کا وجود ہمارے فلسفے، ہماری ثقافت،

ہمارے مذہب اور ہماری ادبیات میں موجود ہیں اور بعض موارد میں یہ اصطلاحات ان مترادف مفاھیم سے زیادہ دقیق تر اور شاداب تر ہیں جو یورپ کی زبانوں میں پائی جاتی ہیں- اس لئے مغربی علم الاجتماع کے کھانچے والے مفاہیم کا ترجمہ اور اس کی تکرار کہ جو زیادہ تر یورپ کی انیسویں صدی کے صنعتی معاشرے کے تجزیے اور بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے کے استعمار گر اور جنگ ساز معاشرے سے حاصل ہوئے ہیں کسی طرح بھی ہماری آج کی زندگی سے مشابہت اور وجہ اشتراک نہیں رکھتے- اس لئے ضروری ہے کہ ہم ان خصوصی قدروں اور رابطوں کو جو ہمارے معاشرے میں پیدا ہوئی ہیں اور جو ہماری سماجی زندگی کے دقائق اور ہمارے معاشرے کی رفتار اور جذبات سے ہم آہنگ ہیں خود اپنے عمل، رد عمل اور سماجی حقائق کی بنیاد پر تجزیہ کریں- اس کام کے لئے ایران کے اسلامی معاشرے کی تاریخ میں جو باتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں اور اس وسیع تمدنی زندگی میں جو مفاہیم اور اصطلاحات سامنے آئے ہیں، ہمیں چاہئے کہ ہم ان کا انتخاب کریں اور انہیں تجزیے کے عمل سے گزاریں- اس نقطۂ نظر سے امت، امامت، عدالت، تقیہ، تقلید، صبر، غیب، شفاعت، ہجرت، کفر، شرک، توحید اور ان جیسے الفاظ، یورپ کے اسی مفہوم یا اس کے قریبی مفہوم والے اصطلاحات سے گویا تر ہیں-

بہر حال علی شریعتی حقائق پر انگلی رکھتا ہے اور مجرد اندیشی سے

اجتناب برتتا ہے' اور اس کے ساتھ وہ ثابت قدم انسان ہے جو خاص اسلامی نظریے اور فکری تقابل کے ساتھ اپنے معاشرے کے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اثبات پسندی (Positivity) اور مارکسیسٹی دو طرح کی سماجیات سے آگے نکل جاتا ہے اور معاشرے کی مذہبی اور عمیق تاریخی شناخت اور اس کے بیان کے ساتھ عصر حاضر کی اسلامی سماجیات کو نئے ابعاد دیتا ہے۔ بات خواہ "اسٹے" کے مفہوم میں ہو' یعنی خواہ مذہبی اور غیر مذہبی گروہوں کے عقائد و اقدار و رفتار کی موجودہ ساخت میں ہو یا "ڈائینامک" (دھماکہ خیز) مفہوم میں کو جو ایرانی معاشرے اور اسلامی امت کے تاریخی بُعد اور اس کے انقلابات کو مختلف ادوار میں دیکھتا ہو اور بالآخر خواہ "معرفت شناسی" کی سطح پر' وہ اپنے تجزیے اور تنقید کو بالکل صحیح خطوط پر دیانتداری سے آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ سماجیات جیسے علم میں علمی "غیر جانبداری" کو صحیح نہیں سمجھتا اور اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ماہرِ سماجیات صرف ایک "دیکھنے والا" ہو۔ خاص طور پر آج کی دنیا میں جہاں علمی غیر جانبداری بہت حد تک اپنے مفہوم کو کھو چکی ہے اور سماجی وفاداری اور مشارکت نے مشاہدے اور توصیف کی جگہ لے لی ہے' اس تناظر میں یہ بات درست ہے کہ اس کے تقریباً سبھی آثار و آراء ایک ماہرِ سماجیات کے نقطہ نظر سے بہ نگاہ غائر' جائزے کی منزل پر آئیں۔ حقیقت میں اس نے اسلامی تمدنی زندگی کے پایوں کو مختلف سطحوں اور حقیقی ابعاد میں

پیش کیا ہے اور جس بصارت کا وہ حامل ہے اس اعتبار سے نیز وہ سبقت لے جانے والا ہے۔

جو بات ہمارے پیش نظر اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ، فلسفہ تاریخ اور تمدنی زندگی کے دین اور شریعت کو توحیدی اور ایک کلی جہاں بینی کے دائرہ میں اپنی توجہات کا مرکز بنایا ہے اور اس کیفیت کے ساتھ توحید، ایک آئیڈیالوجیکی اور ایک فکری ڈھانچے، اور انسان دوستانہ اعتبار سے، فلسفہ تاریخ کی صورت میں انسان اور انسانی معاشروں کی سرگزشت کو دریافت کرنے والا بھی ہے اور انسان کی سرنوشت کی پیش بینی کرنے والا بھی۔

یہ وہ نقطۂ نظر ہے کہ جس میں اس کے سارے فلسفی، تاریخی اور سماجیاتی تجزیے، توحیدی عقیدے کے ساتھ ہیں اور جو یکتا پرستی کی نگاہ میں قابل فہم ہے۔ اور اس مفہوم کو اس نے خود بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

"... اس کیفیت میں توحید مکمل طور آسمان سے زمین پر آتی ہے اور فلسفی، کلامی یا علمی جدل اور بحث و تفسیر و تعلیم کے مراکز سے سماجی جدالوں میں اتر آتی ہے اور ان مسائل کو زیر بحث لاتی ہے جو مختلف گروہوں کے درمیان روابط میں پائے جاتے ہیں۔ اور طبقوں کے روابط، فرد کی محاذ آرائی، فرد اور سماج کے رابطے، سماج کی بنیاد، اس کی تعمیر، اس کے انسٹیٹیوٹس، اس کے گوناگوں ابعاد، گھرانے، سیاست، ثقافت، معاشیات، مالکیت، سماجی

اخلاق' اجتماعی' انفرادی اور طبقاتی روابط و سلوک اور اس فرد یا گروہ کی ذمہ داریوں کو مشخص کرتی ہے کہ جو قوم کے مقابل توحید کے فکری مرکز کا حامل ہے۔

ایک کلی مفہوم میں توحید اس اعتبار سے توحیدی سماج کی فکری عمارت سے متعلق سیمنٹ کا آئیڈیالوجیکی گارا ہے۔ تضاد کے ساتھ 'مادی اقتصادی بنیاد پر قائم معاشرہ (توحیدی معاشرہ) اور بلا تضاد فکری اور اعتقادی بنیاد پر قائم معاشرہ (عالمی توحید)۔

"یہاں توحید و شرک کی گفتگو سماجیات کا ایک عالمی فلسفہ' ایک اقتصادی سوچ' ایک اخلاقی داغ بیل اور ایک حقوقی اور روایتی نظام ہے۔" (اسلام شناسی-۹ اواں درس)۔

یہ نیا نقطہ نظر کہ جو توحیدی فکر کو ایک سماجی منظر میں پیش کرتا ہے اور قوم کی شناخت کو توحیدی فکر سے رابطے میں جانتا ہے' ایک ایسا مرحلہ ہے کہ جو تضادات اور تناقض سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح اس کی عمرانیات' جگ بینی کا انعکاس ہے اور کس طرح یہ جہاں بینی قوم میں اور عمل میں کار فرما ہوتی ہے۔ معاشرتی اور آئیڈیالوجیکی دنیا میں اس کا موضوع سماجی توحید اور سماجی شرک کے درمیان پایا جانے والا وہ جھگڑا ہے جو پوری تاریخ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور اس نے اس موضوع کو "ڈائنامک" انداز سے ذیل کی صورت میں پیش کیا ہے:

"جس طرح جہاں بینی توحید' یعنی جہاں میں توحید' وجود کے ایک حصے کی وحدت کی تفسیر کرتا ہے اسی طرح وہ سماج میں انسانی معاشرے کے ایک حصے کی وحدت کی بھی تفسیر کرتا ہے- اور جس طرح عالم وجود میں' توحید کے عالمی نظام میں' متفرق اور متضاد قوتوں' آسمانی خداؤں' دیوتاؤں اور ماورائی اور غیبی طاقتوں سے لڑنے والا' انسانوں' قوموں اور فطری طاقتوں کی سرنوشت میں موثر ہے اسی طرح انسانی معاشرے میں سماجی توحید' ان زمینی خداؤں کے نفی کرنے والے عامل کے عنوان سے بھی موثر ہے جو غاصبان طاقت اور سماجی نظاموں' طبقوں' لوگوں اور سماجی رابطوں میں مشکل راہیں پیدا کرنے والے ایک کلی مفہوم میں انسانی شرک کے علمبردار ہیں..." (اسلام شناسی-۹ اواں درس)

بہر حال اس کے لئے نہ "عالمانہ اسلام" نہ "عامیانہ اسلام" بلکہ "آگاہانہ اسلام" اہمیت رکھتا ہے اور وہ عالِم مسلمان اور عام مسلمان پر روشن خیال مسلمان کو ترجیح دیتا ہے- یہی وہ مفہوم ہے کہ جہاں اسلام میں "اپنی اصلاح" اور "دوسرے کی اصلاح" لازم و ملزوم ہوتے ہیں- علی شریعتی اس مشہور جملہ کا مفسر ہے جسے وہ بہت پسند کرتا ہے اور ہمیشہ اس کی تکرار کرتا ہے : "رمز زندگی' یعنی عقیدہ اور جنگ باقی کچھ نہیں" (اسلام شناسی- ۱۹ واں درس)

اور یہ وہ پیغام ہے کہ جو ہمارے زمانے کے آگاہ مسلمان کے لئے حیاتی

بھی ہے اور فوری بھی۔ لیکن خصوصی طور پر اس کے مخاطب پاکدل اور آگاہ نوجوان ہیں :... "اس لئے کہ نوجوان اگر عقیدے اور ایمان کے حامل ہوں تو وہ اس کے سودائی ہو جائیں گے اور بڑی تیزی سے محنتی، پُرکار اور سرگرم عناصر میں تبدیل ہو کر کھلی فضا میں سانس لیں گے۔"

علی شریعتی کے بارے میں ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اپنی جگہ، مگر اس کی عظمت اور بزرگی پر بہترین دلیل اس کی "زندگی" اور اس کی "کتابیں" ہیں۔

اب تک شائع ہونے والی اس کی کتابوں کی فہرست حاضر خدمت ہے :

ان تقریروں اور ان دروس کی فہرست جو "حسینیۂ ارشاد" میں روبعمل آئیں :

۱- تاریخ ادیان (ایک سے ۱۴ دروس تک)

۲- اسلام شناسی (۱۵ سے آخری درس تک) (۱۹۶۸ء)

۳- نگاہی بہ تاریخ فردا (کل کی تاریخ پر ایک نظر)

۴- نسل نو مسلمان (مسلمانوں کی نئی نسل)

۵- روش شناخت اسلام (اسلام کے سمجھنے کی روش) (۱۹۶۸ء)

۶- علیؑ، حقیقی برگونہ اساطیر (علی ایک دیومالائی سچ)

۷- امت و امامت در جامعہ شناسی (سماجیات میں امت اور امامت) (۱۹۴۶ء)

۸- متمدن و متجدد

۹- علیؑ تنہا است (علی تنہا ہیں)

۱۰- علیؑ وحیات بار ورش (موت کے بعد علیؑ کی حیات آفریں زندگی)
پس از مرگ (تین حصوں میں)

۱۱- علیؑ انسان تمام (علیؑ ایک مکمل انسان)

۱۲- میعاد با ابراہیمؑ

۱۳- نیایش (دعا)

۱۴- تاریخ و ارزش آن در اسلام (اسلام میں تاریخ اور اس کی اہمیت)

۱۵- مذہب علیہ مذہب (مذہب' خلاف مذہب)

۱۶- روشن فکر مسئول (ذمہ دار روشن خیال آدمی)

۱۷- فلسفہ تاریخ در اسلام (اسلام میں فلسفہ تاریخ)
(در ادیان ابراہیمی) (ابراہیمی ادیان میں)

۱۸- فاطمہؑ' فاطمہؑ است (فاطمہؑ' فاطمہؑ ہے)
(۱۹۷۱ء- اشاعت: ارشاد)

۱۹- انتظار' مذہب اعتراض (انتظار' مذہب اعتراض)(۱۹۴۴ء)

۲۰- تشیع علوی و تشیع صفوی

۲۱- مسئولیت شیعہ بودن (شیعہ ہونے کی ذمہ داری)(۱۹۴۴ء)

۲۲- ۲۳سال فداکاری درراہ مکتب (مکتب کی راہ میں ۲۳سال جانبازی)

۲۳-چہ نیازی بہ علیؑ ؟ (علیؑ کی ضرورت کیوں)

۲۴-آری این چنین بود ای برادر (ہاں دوست ایسا ہی تھا)

۲۵- علیؑ بنیان گزار وحدت (علیؑ امین وحدت)

۲۶-پدر، مادر، ما متہمیم (ماں، باپ، ہم مقصر ٹھرائے گئے ہیں)

۲۷-شہادت (۱۹۴۵ء-اشاعت :ارشاد)

۲۸- نقش انقلابی یادویاد آوران در تاریخ تشیع (شیعی تاریخ میں ذکر اور ذاکرین کا انقلابی کردار) ۱۹۴۵ء-اشاعت :ارشاد

۲۹- قرن ما در جستجوی علیؑ (علیؑ کی جستجو میں ہماری صدی)

۳۰- سیمینار (ایام فاطمیہ) (سیمینار)(جناب سیدہ کی سوگواری کے دن)

۳۱-ہجرت وتمدن

۳۲- تشیع سرخ ("مجاہدین" نامی کھیل کے بارے میں گفتگو)

۳۳-مقدمہ ای بر نماشنامہ ابوذر (ابوذر تمثیلی کھیل پر ایک مقدمہ)

۳۴-شیعہ یک حزب تمام (شیعہ، ایک کمال پر فائز پارٹی)

۳۵-پیروان علیؑ و رنجہایشان (علیؑ کے پیروکار اور ان کے دکھ)

۳۶-پیام امید بہ روشن فکر مسئول (ذمہ دار روشن خیال آدمی کی خدمت میں
(تفسیر سورہ روم) ایک امید بھرا پیغام) (سورہ روم کی تفسیر)

۳۷-قاسطین، مارقین، ناکثین (اشاعت: ارشاد-۱۹۴۵ء)

۳۸-اسلام در امریکا (امریکہ میں اسلام)

۳۹-دائرۃ المعارف شیعہ (شیعہ انسائیکلوپیڈیا)

۴۰-علیؑ اگر می گفت آری (علیؑ اگر ہاں کہہ دیتے)

۴۱-علیؑ یک روح در چند بُعد (علیؑ، کئی جہت والی ایک ہستی)

۴۲- پیروزی در شکست (ہار میں جیت)

۴۳-ماشین در اسارت ماشین (مشین، مشین کی قید میں)

۴۴-چہ باید کرد؟ (ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟)

۴۵-فلسفۂ نیایش (دعا کا فلسفہ)

۴۶-علیؑ، مکتب، وحدت، عدالت (۱۹۶۹ء-اشاعت: ارشاد)

۴۷- تقریر (علامہ اقبال کے خراج عقیدت پر مبنی
(کنگرہ بزرگداشت اقبال) کانفرنس میں تقریر)

۴۸-میز گرد (گول میز کانفرنس-سوالات، انتقادات اور
اس کے جوابات جو دو جلدوں میں شائع ہوئے)

۴۹-حج

ان کانفرنسوں کی فہرست جو یونیورسٹیوں اور فوقانیہ اسکولوں میں منعقد ہوئیں:

۱-از کجا آغاز کنیم ؟	(نقطہ آغاز کہاں سے ہوا؟)(صنعتی یونیورسٹی)
۲-جامعہ شناسی شرک	(سماجیات شرک) (تہران آرٹ کالج)
۳-انقلاب در ارز شہا	(اقدار میں انقلاب) (تہران آرٹ کالج)
۴-ریشہ ہای اقتصادی- طبقاتی رنسانس	(اقتصادی-طبقاتی احیاء نو کی جڑیں) (ٹریڈ کالج)
۵-متدولوژی علم	(سائنس کی میتھاڈولوجی)(ٹریڈ کالج)
۶-عالم یا اسکولاستیک جدید	(عالم یا جدید اسکولیسٹک) (تہران میڈیکل کالج)
۷-انسان و تاریخ	(انسان اور تاریخ)(تہران انجینئرنگ کالج)
۸-چہار زندان انسان	(تربیتی علوم سے متعلق ہائی اسکول)
۹-اگزیستانسیالیزم	(اگزسٹینسیلیزم)(قومی یونیورسٹی)
۱۰-علل انحطاط مذاہب	(مذاہب کے انحطاط کے اسباب) (قومی یونیورسٹی)
۱۱-استاندارد ہای ثابت در تعلیم و تربیت	(تعلیم و تربیت میں اٹل اسٹینڈرڈ) (سپاہ حفظان صحت ٹریننگ اسکول)

۱۲-استعمار	(استعمار کی ایک قسم)
	(علوم پر مبنی لیڈیز ہائی اسکول)
۱۳-استخراج و تصفیہ	(ثقافتی ذخائر کا اخراج اور ان کی اصطلاح)
منابع فرہنگی	(کالج آف پٹرولیم)
۱۴جہاں بینی	(جہاں بینی)(آبادان کالج آف پیٹرولیم)
۱۵-مخروط فرہنگ شناسی	(مخروط ثقافت شناسی)(کالج آف پٹرولیم)
۱۶-فرہنگ وایدوٴلوژی	(آئیڈیالوجی اور ثقافت) تہران ٹریننگ اسکول)
۱۷-ایمان در علم	(سائنس میں ایمان)
	(مشہد یونیورسٹی-رازی ہال)
۱۸-ھنر در انتظار موعود	(فن انتظار موعود میں)
۱۹-انسان دیروز و انسان امروز	(کل کا انسان اور آج کا انسان)
	(مشہد یونیورسٹی)
۲۰-بازگشت بہ خویشتن	(اپنی ذات کی طرف بازگشت)
	(جندشاپور اھواز یونیورسٹی)
۲۱-نیازھای انسان امروز	(آج کے انسان کی ضرورتیں)
	(جندشاپور اھواز یونیورسٹی)

۲۲-انسانی بی خود (بے کار انسان یا کھویا ہوا انسان)
(آرٹ کالج تہران-۱۹۴۴ء)

۲۳-روح جدید علم (سائنس کی نئی روح)(صنعتی یونیورسٹی)

۲۴-خدا در خانہ یک کنیز (خدا ایک کنیز کے گھر میں)(مشہد یونیورسٹی)

۲۵-ایدئولوژی (آئیڈیالوجی)(کالج آف پٹرولیم)

۲۶-رسالت روشن فکر برای ساختن جامعہ (معاشرے کی تعمیر کے لئے روشن خیال آدمی کی ذمہ داری)(کالج آف پٹرولیم)

۲۷- تأمل در خویش (اپنی ذات میں تامل)

مشہد یونیورسٹی میں ڈاکٹر علی شریعتی کے علمی دروس (۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۱ء تک):

۱- تاریخ اسلام (۷-۱۳۴۶ شمسی)(تاریخ اسلام)
(۸-۱۹۶۷ء) آرٹ کالج

۲-درسہای تاریخ ادیان (تاریخ ادیان کے دروس)
(۳ نشستوں میں-آرٹ کالج)

۳-درس تاریخ تمدن (چار نشستوں میں)

۴-تاریخ قرون جدید (نئی صدی کی تاریخ)
(تین سال تدریس-۳ جلدوں میں)

۵- قرون جدید (نئی صدیاں)

۶- جہان در آستانہ بعثت' (دنیا بعثت کی چوکھٹ پر' پہلا چپڑ ایران)
فصل اول ایران (مختلف ابواب میں آرٹ کالج کے دروس)

۷- سیاتیسم (علم پرستی) وپیدائش (رنا سینس سے ۱۹۶۴ء تک سائینٹسزم
طبقہ روشن فکر "قرون جدید" (علم پرستی) اور نئی صدیوں کے روشن
از رنسانس تا ۱۹۶۴ خیال طبقے کا ظہور)

۸- رنسانس و تاریخ اروپا از (۴۵-۱۹۶۴ کے تاریخ سے متعلق
پایان قرون وسطی تا ۱۶۶۰ طلبہ کے لئے) قرون وسطی کے اختتام
(سال سوم رشتہ تاریخ سے ۱۶۶۰ تک رنا سینس اور یورپی تاریخ
۶-۱۳۴۵ شمسی)

۹- درک فلسفہ و معارف اسلامی (اسلامی معارف اور فلسفے کا درک)

۱۰- جامعہ شناسی مکتب و آثار (آلبر کامو کے آثار اور اس کے مکتب کی
آلبر کامو بعنوان شاگرد سماجیات) (آرٹ کالج)
لوکرک

۱۱- انسان در تمدن جدید (انسان' نئے تمدن میں) (تاریخ تمدن
کے دروس) (آرٹ کالج)

۱۲- مکتب ہا و نظر ہائے (مکاتیب اور تاریخ کے گوناگوں نظریے)
گوناگون تاریخ (۱۹۶۶ء کی فوٹو کاپی- درس فلسفہ تاریخ)

۱۳- دین و سرگذشتش	(دین اور اس کی سرگزشت) (تاریخ ادیان، دوسری جلد)
۱۴- پس از پیغمبرؐ	(جناب رسالتمآبؐ کے بعد) (فوٹو کاپی- درس اسلام شناسی)
۱۵- فلسفہ تاریخ	(فلسفہ تاریخ) (آرٹ کالج- سبجیکٹ تاریخ- دو پیریڈ)
۱۶- تاریخ کشورہای مجاور	(آس پاس کے ممالک کی تاریخ)
۱۷- تاریخ عقائد سیاسی و اقتصادی	(سیاسی اور اقتصادی عقائد کی تاریخ) (۱۹۶۶ء- ۱۹۶۷ء آرٹ کالج، فورتھ ایئر)
۱۸- تاریخ ایران پس از اسلام	(اسلام کے بعد ایران کی تاریخ) (آرٹ کالج)
۱۹- تاریخ علم	(سائنس کی تاریخ) (فکلٹی آف سائنسز)
۲۰- پیروزی پس از شکست	(شکست کے بعد کامیابی)

دیگر تقاریر:

۱- پس از شہادت	(بعد شہادت) (۱۹۷۰- مسجد نارمک)
۲- تاریخ در اسلام	(اسلام میں تاریخ) (۱۹۶۹- مسجد الجواد)
۳- تمدن و تجدد	
۴- تمدن و تجدد	(مڈل اسکول- مشہد- سرپرست اعلیٰ ہاشم)

۵-یک ماہ پا بہ پای پیامبرؐ (ایک ماہ جناب ختمی مرتبتؐ کے قدم بہ قدم) کاروان ارشاد کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں ایک مرتبہ اور ۱۹۷۰ء میں دو مرتبہ سفر حج میں عمل پذیر ہونے والی تقریروں کا مجموعہ (تین مبحث میں)

۶- بعث و وصایت (انجینئرز سوسائٹی تہران) (دموکراسی ور ہبری انقلابی)

ان کتابوں کی فہرست جنہیں علی شریعتی نے بقلم خود لکھا :

۱-تاریچہ تکامل فلسفہ (فلسفہ کے تکامل کی مختصر تاریخ) (پہلا حصہ، مکتب واسطہ) ناشر : کانون نشر حقائق اسلامی مشہد-۱۹۵۵ء عیسوی

۲-مکتب رابطہ (رابطہ والا مکتب) (مختصر کتابچوں کا مجموعہ) ناشر : کانون نشر حقائق اسلامی مشہد-۱۹۵۵ء

۳-خراسان (ناشر : سازمان جلب سیاحان-۱۹۶۶ء)

۴-اسلام شناسی (ناشر : شرکت انتشار)

۵-کویر (دشت یا صحرا) ناشر : شرکت انتشار مشہد

۶-انسان واسلام (آباد ان کالج آف پٹرولیم کے کانفرنسز کا مجموعہ-ناشر: شرکت انتشارات)

۷-بازگشت بہ خویشتن (اپنی ذات کی طرف بازگشت)

۸-توحید یک فلسفہ تاریخ (توحید' تاریخ کا ایک فلسفہ)(۱۹۴۵ء)

ان خطی یا مطبوعہ کتابوں کی فہرست جنہیں علی شریعتی نے ترجمہ کیا:

۱-نمونہ عالی اخلاق در اسلام (اسلام میں اخلاق کا اعلیٰ نمونہ) کاشف الغطاء کی کتاب کا ترجمہ ناشر: کانون حقائق اسلامی

۲-بیان الادیان (مکمل-باب پنجم کی تنقیدی تصحیح کے ساتھ)

۳-در نقد وادب (انتقاد وادب میں) تحریر: ڈاکٹر مندور

۴-نیایش (دعا) تحریر: ڈاکٹر الکسس کارل (۱۹۴۹ء)

۵-ابوذر غفاری تحریر: عبدالحمید جودۃ السحار (۱۹۵۶ء)

۶-سلمان پاک (تحریر: لوئی میسینیون)

۷-ادبیات چیست؟ (ادبیات کیا ہیں؟) تحریر: جان پول سارتر

۸-نفرین شدگان زمین (زمین کے پھٹکارے ہوئے لوگ) (مغضوبین زمین) تحریر: فرانتز فانون

۹-سال پنجم انقلاب الجزائری (الجزائری انقلاب کا پانچواں سال)

تحریر: فرانتز فانون

کتابوں اور مقالوں پر مقدمے:

۱- حسن اکبری کی "حجر بن عدی" نامی کتاب پر مقدمہ

۲- مختلف اوقات میں چھپنے والے "گاھنامے" میں مناسک کے عنوان سے مقالہ

۳- انسان بی خود (کھوئے ہوئے انسان) کے نام سے "انسان و جہاں" نامی کتاب پر مقدمہ

۴- "محمدؐ خاتم پیامبران" نامی کتاب میں "از ہجرت تا وفات" کے عنوان سے مقالہ

ملکی روزناموں اور مجلّوں میں شایع ہونے والے مقالے:

۱- مجلّہ فردوسی ۱۹۷۷ عیسوی کے ۹۷۷ ویں شمارے میں چھپنے والا مقالہ: "دوست کی غلیل کا ایک پتھر"

۲- "دربارہ صھیونیسم" (صھیونیزم کے بارے میں)

۳- مشہد کے روزنامہ ھیر مند ۱۹۶۷ء کے پہلے شمارے میں "ادبیات کیا

ہیں؟" سے متعلق اخبار کے ایک خصوصی حصے میں علی شریعتی کا
"سارتر کا شعر کیا ہے" نامی مقالہ

۴-۱۹۵۹ء میں خراسان سے نکلنے والے "مجلّہ فرھنگ" کے چھٹے شمارے
میں "میں سوچتا ہوں' اس لئے میں ہوں" نامی مقالہ

۵-۱۹۶۱ء کے مجلّہ آستان قدس میں استاد محمد تقی شریعتی کے ایک خط کے
ساتھ چھپنے والا علی شریعتی کا "بدبینی اور خوش بینی" کا ترجمہ

۶-روزنامہ خراسان کے ۱۹۶۷ء میں چھپنے والے اخبار میں علی شریعتی کی "ٹائن
بی کا مقالہ اور تاریخ" نامی تحریر

۷- آبادان کے کالج آف پیٹرولیم سے نکلنے والے ایک رسالے "مجلّہ پیام"
پر علی شریعتی کا ایک مقالہ-

خطوط:

۱-ڈاکٹر علی شریعتی کا خط اپنے بیٹے "احسان" کے نام

۲- علی شریعتی کا خط اپنے والد کے نام

۳- علی شریعتی کا خط "پرویز خرسند" کے نام

۴- فرانسس فانون کے خطوط علی شریعتی کے نام

۵-وہ خطوط جو علی شریعتی نے حسینیہ ارشاد کو لکھے

۶- علی شریعتی کا خط سید ابراھیم میلانی کے نام

دیگر آثار:

۱- لوممبا کے مارے جانے کے موقع پر پیرس کے سیتا نامی جیل میں ایک افریقی لیڈر گیوزسے علی شریعتی کا انٹرویو

۲- آقائی محمد رضا حکیمی کی "سرود جہشہا" نامی کتاب کے آخر میں، فرانسیسی زبان میں شورشوں کے ترانے نامی مقالہ

۳- اقبال کے اس خط کا ترجمہ جسے انہوں نے سر سید احمد خان کو لکھا تھا، علی شریعتی کے مقدمے کے ساتھ

۴- لکھائی

۵- دو شہید (ابوذر اور حر)

۶- اسلام سے مغل تک

۷- وہ ایک ہزار تجارتی اور اقتصادی الفاظ کہ جو دوسری زبانوں میں گھر کر گئے۔

۸- "حر" نامی تمثیل کا متن۔

۹- مقالہ توحید (۴ صفحوں میں)

۱۰- نہج البلاغہ کے ۱۵ خطبوں پر ایک نظر۔

۱۱- تہران یونیورسٹی کی آرٹ گیلری کا معاینہ اور چند سوالات پیش کرنا۔

۱۲- ایک، اور اس کے آگے بے نہایت صفر - نیا ایڈیشن "ایک اور صفر"

۱۳-مشہد میں ایک دوست کو خط-

۱۴-یحیٰی بن فضل... (یونیورسٹی کی تھیسز)

۱۵-فانون کی کتاب "سیاہ پوست اور سفید قلب" نامی کتاب کا ترجمہ-

۱۶-"نقدوادب" نامی رسالے کے نام خط-

۱۷-ثار

۱۸-صالحات وحسنات

۱۹-قرآن میں طبقاتی منحنی

۲۰-چگونہ باید امروز زن روز بود (آج کی عورت کو کس طرح آج کی عورت ہونا چاہیے) (دست نویس)

۱۲-الیناسیون (الینیشن)

۲۲-مبانی مسئولیت درانسان (انسان میں ذمہ داری کی بنا)

۲۳-تاریخ ادیان (اشاعت: پولی ٹیکنیک)

۲۴-رنج بو دن (ہونے کا دکھ) (خلقت آدم کی کہانی)

۲۵- کامپیوتر (کمپیوٹر)

۲۶-خدا حافظ شہر شہادت

۲۷-توتم پرستی

۲۸-زیربنای توحید (توحید کی نیو)

۲۹-وزارت تعلیم کے لئے ایک تحقیقی رسالہ

۳۰-انقلاب شیعہ سربداریہ (بیباک شیعہ انقلاب)

۳۱-کیا مسلمانوں نے "کریسٹف کولمبس" سے پہلے امریکہ کو دریافت کیا ہے؟ (اشبیلیہ کے مسلمانوں کے ذریعے امریکہ کی دریافت کے بارے میں ایک مدلل مقالہ) (مجلّہ فرھنگ-۱۹۵۷ء)

تمت بالخیر

چون چراغ لاله سوزم درخیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما

اور اگر میرا گلا گھونٹا جائے
تب بھی میں سمجھوتہ نہیں
کرونگا اور حقیقت کو مصلحت پر
قربان نہیں ہونے دونگا

ہر کسی کے فیصلے کی قوت، اس کی شخصیت کی برجستہ ترین اور ممتاز ترین علامت ہے اور وہ لوگ جو کسی شخص، کسی سوچ، کسی اثر، کسی تحریک اور کسی واقعیت کے خلاف "علی ما نقل" یا سنی سنائی بات کی بیاد پر فیصلہ کرتے ہیں، اور ان کے سارے افکار و احکام کی بیاد "فلان شخص بتاتا ہے" پر ہوتی ہے، قبل اس کے کہ کسی حقیقت کی جاہلانہ اور غیر منصفانہ انداز میں مذمت کریں ایسے مستضعف، ناتواں اور سبک عقل لوگ ہوتے ہیں کہ جنہوں نے "خود" کو زمانے کی قوتوں، زور آور یا وہ گروں اور پیداو پنہاں تبلیغاتی تنظیموں، کی فکری بردگی کے حوالے کیا ہے اور اس بات کو آشکار کیا ہے کہ وہ ان خلاف واقع باتوں، تہمتوں اور افواہوں کی جگالی کرنے والے عاجز لوگ ہیں کہ جنہیں "دشمن" حکم دیتا ہے، "منافق" گڑھتا ہے، "عوام فریب" لوگ اس کی تشہیر کرتے ہیں اور عام آدمی اسے آمنا صدقنا کہتے ہیں۔

050-